مسئلہ انتخابات

اور

مسلمانانِ ہند

ابو اللیث اصلاحی ندوی

مکتبہ جماعت اسلامی ہند

مسئلۂ انتخابات

اور

مسلمانانِ ہند

حصہ اوّل

مولانا ابواللیث اصلاحی

مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند

رام پور - یو - پی

بار دوم .... جنوری ۱۹۵۲ء

تعداد اشاعت .... ایک ہزار ۱۰۰۰

مطبوعہ .... ناظم پریس رامپور

قیمت .... چودہ آنے (۱۴)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

تقسیم کے بعد ہندوستان کے مسلمان جس حالت میں زندگی گذار رہے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کو ہر طرف سے ایسے احوال و مسائل نے آگھیرا ہے کہ اگر اس موقع پر ان کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ یہ قوم ایک طرف اس ملک کے لیے وبالِ جان بن جائے گی جس میں وہ رہ رہی ہے — کیونکہ اس وقت اس قوم کی سب سے نمایاں خصوصیت، مایوسی و اضطراب اور احساس کمتری ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ کسی ملک کے چار کروڑ سے زائد اشخاص پر اس قسم کی حالت کا طاری ہونا اس ملک کے حال و مستقبل کے لیے کوئی خوش گوار علامت نہیں ہے — اور دوسری طرف یہ قوم ان حالات میں گھر کر رفتہ رفتہ اسلام اور اپنی ملّی خصوصیات سے بھی بالکل کوری ہو جائے گی جس کے بعد اگر یہ باقی بھی رہی تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا وجود و عدم دونوں برابر ہوگا۔

مسلمانوں کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے رہنمایانِ ملّت کا فرض تھا کہ وہ اس موقع پر آگے بڑھتے اور اتنی بڑی قوم کو یوں تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچاتے لیکن یہ دیکھ کر ہمارا دل خون ہوتا ہے کہ جن لوگوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ حقیقتاً اس کے اہل بھی ہو سکتے تھے وہ یا تو خود مایوسی کا شکار ہو کر

گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں یا اگر ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ کر رہنمائی کا کام انجام دینا چاہتے ہیں تو وہ بالعموم اصلاح کے ایسے نسخے تجویز کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے اصل مرض اور اس کے علاج سے کوئی حقیقی تعلق نہیں رکھتے، ان کا مقصد یا تو دفع الوقتی ہے کہ ان کے خیال کے مطابق جب قوم مر رہی ہی ہے تو علاج و معالجہ سے فائدہ کیا ہے یا ان میں مریض کے مزاج اور اصل علت سے مرض زیادہ جو اور موسمی حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لیے یہ تو ممکن ہے کہ وقتی طور سے ان نسخوں سے مریض کو کچھ تسکین حاصل ہو جائے لیکن جہاں تک اصل مرض کا تعلق ہے وہ ان نسخوں کے بعد بھی شاید جوں کا توں باقی رہ جائے اور اس لیے جو خطرات اس مریض کو درپیش ہیں وہ روز بروز ابھر کے سامنے آ رہے ہیں۔ اور یہ صورتِ حال ہمارے لیے اور زیادہ قلق افزا ہے کیونکہ کچھ نہ ہونے کی حالت میں تو مریض کو اپنی صحت کی کم از کم فکر ہی ہو سکتی ہے لیکن اس صورت میں تو وہ اس جھوٹے اطمینان میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ وہ علاج کر رہا ہے حالانکہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، علاج نہیں ہے۔

ہم اس خام خیالی میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کوئی آسان کام ہے حقیقتاً یہ کام اتنا مشکل اور پیچیدہ ہے کہ اس کے لیے ایک دو یا چند اشخاص کی فکر کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ اس کام کے لیے پوری ملت کے اربابِ فکر کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے لیکن مذکورہ بالا حالات کو سامنے رکھتے ہوئے طبیعت اس پر راضی نہیں ہوتی کہ جب تک یہ کام نہیں ہوتا ہے اس وقت تک ہم بالکلیہ خاموش رہیں، بلکہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم اس ضمن میں جو کچھ سوچ رہے ہیں اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں محض اس لیے دریغ نہ کریں کہ دوسرے لوگ اس موقع پر خاموش ہیں اور خاص طور سے یہ احساس اس کے لیے اور زیادہ محرک بن رہا ہے

کہ ہم جو کچھ پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے نزدیک قرآن وحدیث سے براہِ راست حاصل کیا ہوا نسخہ ہے اس لیے اس کو پیش کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

اسی احساس کے تحت تقریباً ایک سال پہلے میں نے ماہنامہ "زندگی" (رامپور) میں مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کا مقصود یہی تھا کہ ملک و ملت کے صحیح حالات کا جائزہ لیا جائے اور اس ضمن میں جو مختلف حل لوگوں کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں ان کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ وہ کہاں تک صحیح اور قابلِ قبول ہیں۔ اور اس کے بعد یہ واضح کیا جائے کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے مسائل کا صحیح حل کیا ہے، لیکن ابھی اس سلسلہ کے چند ہی مقالات شائع ہوئے تھے کہ ملک میں الیکشن کا چرچا شروع ہو گیا اور چونکہ آئندہ الیکشن کو گوناگوں وجوہ سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اس کے نتائج مسلمانوں کے حال و مستقبل پر بہت گہرا اثر ڈالنے والے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلہ کو عارضی طور سے ملتوی کر کے پہلے الیکشن کے مسئلہ پر جو بہرحال اسی عمومی مسئلہ کی ہی ایک کڑی ہے گفتگو کر کے یہ واضح کیا جائے کہ مسلمانوں کے لیے صحیح طریقہ کار اس میں کیا ہے اور اس سے فارغ ہو کر اس اصل سلسلہ کو شروع کیا جائے۔ اس خیال کے تحت میں نے الیکشن پر لکھنا شروع کیا چنانچہ اس وقت تک اس کے سلسلہ میں متعدد نمبر شائع ہو چکے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ جن لوگوں نے اس سلسلہ کو ملاحظہ فرمایا ہے وہ اس کو پسند کرتے اور اسے وقت کی ایک ضروری چیز سمجھتے ہیں چنانچہ متعدد رسائل نے اس کو اپنے صفحات میں نقل کیا ہے اور کثرت سے لوگوں نے یہ خواہش کی ہے کہ اس کو مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ انہی حضرات کی خواہش و مطالبہ کی تکمیل ہے۔

ارادہ تھا کہ اس سلسلۂ مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرنے سے پہلے میں اس پر کچھ اطمینان کے ساتھ نظر ثانی کر سکتا لیکن افسوس ہے کہ مصروفیتوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور تاہم نظرِ ثانی میں کافی اصلاح و ترمیم اور اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلۂ مقالات کا جو اصل مقصود تھا یعنی یہ کہ مختلف طریق ہائے عمل میں سے صحیح طریق عمل کھل کر سامنے آجائے اس کے لحاظ سے یہ ناگزیر تھا کہ ان طریق ہائے عمل پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے اس لیے مجھے اس کتاب میں جا بجا مختلف جماعتوں اور اداروں کے مقاصد و طریق کار پر تھوڑی بہت تنقید کرنی پڑی ہے، یہ کام میں نے بادلِ ناخواستہ محض بہ تقاضائے ضرورت کیا ہے اس لیے اس کے لیے مجھے معذور سمجھا جائے اور اس سے کوئی غلط معنی نہ نکالے جائیں۔

"ابو اللیث"

رام پور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتخابات کی اہمیت

جمہوری نظام حکومت میں انتخابات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور نظم ونسق اور عام ملکی حالات میں ہر طرح کے اچھے یا بُرے انقلابات وتبدیلیوں کا دامن انتخابات ہی کے ساتھ بندھا ہوا رہتا ہے، اس لیے ہندوستان میں بھی جمہوریت کے ابتدائی تجربہ ہی کے وقت سے انتخابات کی اچھی خاصی اہمیت محسوس کی جاتی رہی ہے لیکن آزادی کے بعد انتخابات کی اس اہمیت میں اب بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ آئندہ انتخاب آئینِ جدید کے بموجب بالغ رائے دہندگی کے اصول پر منعقد ہونے والا ہے اور اس وقت ملک میں متعدد ایسی پارٹیاں موجود ہیں جو اپنے سامنے ملک کے نظمِ حکومت کے بارے میں اپنا خاص اور ایک دوسرے سے مختلف نظام اور پروگرام رکھتی ہیں اس لیے اس وقت انتخابات کا مسئلہ بڑے معرکہ کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور لوگ سب سے زیادہ اسی کی طرف متوجہ ہیں۔ ہر پارٹی جو الیکشن میں حصہ لینا چاہتی ہے وہ ابھی سے اس کے لیے سرگرم عمل ہے

ہر طرح کی تیاریاں مکمل کی جا رہی ہیں تاکہ انتخابات میں زیادہ سے زیادہ کامیابیاں حاصل کی جا سکیں اور اس موقع کے ضائع ہو جانے کے بعد آئندہ پانچ سال تک انھیں زحمت کشِ انتظار نہ ہونا پڑے۔ جو جماعتیں حکومت و اقتدار سے اس وقت محروم ہیں ان کی سرگرمیاں خاص طور سے بہت تیز ہیں اور یہ بالکل قدرتی بات ہے کیونکہ انھیں ایک رائج و مقبول نظام حکومت کا مقابلہ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی قائم شدہ نظم حکومت کو اکھاڑ پھینکنا کوئی آسان بات نہیں ہے، اور جو پارٹی برسر اقتدار ہے وہ بھی ہر چند اپنی جگہ کچھ مطمئن سی ہے لیکن وہ بھی اپنی تیاریوں سے غافل نہیں ہے، اس نے بھی الیکشن جیتنے کے لیے ہر طرح کے انتظامات شروع کر دئے ہیں۔ کانگریس کے آئین پر نظر ثانی، کانگریس کی اندرونی اصلاح کے چرچے اور مختلف کمیٹیوں کا قیام یہ سب اسی تیاری کی تمہید ہیں بہر حال آزاد ہندوستان کے اس پہلے انتخاب کی اہمیت کو یہاں کی ہر جماعت پوری طرح محسوس کر رہی ہے اور اسی کے مطابق اپنی پوری کوشش کے ساتھ اس انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سرگرم کار ہے۔

مسلمانوں کی غفلت

لیکن جہاں ایک طرف انتخابات کی یہ ہماہمی ہے اور اس کے لیے شدّ و مد کے ساتھ یہ تیاریاں ہیں وہیں یہ بات بھی ہمارے لیے انتہائی رنج و قلق کا موجب ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے یہ انتخابات گویا کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔ ان کی مجلسیں بالعموم ان کے ذکر سے خالی ہیں یا اگر ان کا ذکر

ہے بھی تو محض اس حیثیت سے کہ ملک میں کوئی تماشا ہونے والا ہے جس میں ان کو محض لطف و تفریح کے لیے حصہ لینا ہے، اس سے زیادہ ان کو اس سے کوئی غرض و مطلب نہیں ہے۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق مسلمانوں کی اکثریت ان ہی دو قسموں میں منقسم ہے۔ ان کے علاوہ جو لوگ ہیں ان کو مسئلہ انتخاب سے بلا شبہ دل چسپی ہے لیکن ان کی دل چسپی محض اس پہلو سے ہے کہ ان کو ہندوستان کی چند مخصوص پارٹیوں میں سے کسی ایک کو اپنی تائید و حمایت کے لیے منتخب کرنا ہے یا وہ پہلے ہی سے ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر چکے ہیں اور اب اس کو انتخاب میں کامیاب بنانے کے لیے میدانِ جہاد میں اترنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ انتخابات ان کی قسمت پر بھی اثر انداز ہونے والے ہیں اور ان کا ان کی مخصوص ملی حیثیت پر بھی بہت گہرا اثر پڑنے والا ہے اس لیے انھیں اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے ان کا مطالعہ کرنا ہے اور اس کے مطابق کسی عملی اقدام کی ضرورت ہے تو اس اہم تر سوال سے ان کے ذہن یکسر خالی ہیں۔ کیا کسی قوم کی اجتماعی موت کا اس سے بڑا بھی کوئی ثبوت ہو سکتا ہے اور اگر اس حالت کے نتائج کو ذہن میں رکھ کر غور کیا جائے تو کیا اس سے بھی کوئی بڑا موقع حسرت و ماتم کا ہو سکتا ہے؟

غفلت کے مُہلک نتائج

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ کے قریب ہے اور بظاہر ان کا فیصلہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقل طور پر یہیں رہ کر زندگی گذارنا چاہتے ہیں کیونکہ اگر یہ بھاگنے والے لوگ ہوتے یا ان کے لیے بھاگنے کے مواقع اور سہولتیں ہوتیں تو وہ آج سے پہلے اس وقت بھاگ چکے ہوتے، جب کہ یہاں کے

خاص حالات کے تحت یہاں سے مسلمانوں کی عام بھگدڑ مچی ہوئی تھی مگر جب اس وقت انھوں نے بھاگنے کا نام نہیں لیا تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کی حد تک اپنی قسمت ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر چکے ہیں اور وہ اسی سرزمین میں زندہ رہ کر اسی کی خاک میں پیوست بھی ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بات اگر صحیح ہے تو یہ نہایت ہی عجیب بات ہے کہ وہ یہاں کے عام حالات یہاں تک کہ انتخابات جیسے مسائل سے بھی بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں!

اس ضمن میں پہلی اہم بات یہ ہے کہ قوموں کی زندگی کا دارومدار عمل اور حرکت پر ہے، جمود و تعطل موت کا پروانہ ہے۔ اس لیے مسلمان اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنا یہ رویّہ لازماً بدلنا پڑے گا۔ ورنہ زمانہ ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرے گا جو مردہ لاشوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ ان کو روندتا کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا اور یہ قوم موت کی سسکیوں میں مبتلا ہو کر وقت پر اپنا دم توڑ دے گی۔ لَاسَامَحَ اللّٰہُ!

دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی قوم معاملاتِ زندگی سے غیر متعلق ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس زمانہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ کسی ملک کے چھوٹے بڑے ہر انقلاب کا اثر اس کے گوشے گوشے پر پڑتا ہے اور چھوٹی بڑی ہر قوم اس سے متاثر ہوتی ہے اس لیے مسلمانوں کو یہاں کے ہر پیش آنے والے انقلاب پر بہت گہری نظر رکھنی چاہیے، اور اس کے مطابق ان کو اپنی تیاریاں کرنی چاہئیں ورنہ یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی کہ آپ میٹھی نیند سوتے رہیں اور کوئی خطرناک انقلاب دفعتاً اس طرح آپ کے سروں پر آ کر کھڑا

ہو جائے کہ اس کو دیکھ کر آپ کے ہوش و حواس جواب دے دیں اور آپ کے لیے اس سے کوئی جائے فرار باقی نہ رہ جائے یا جس چیز کو آپ تماشا سمجھ کر اس سے لطف و تفریح حاصل کرنا چاہتے ہوں اسی سے آپ کے لیے کوئی ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو جو آپ کی رہی سہی حیثیت کو بھی ختم کر دے۔

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، انتخاب اس زمانہ میں طرح طرح کے انقلابات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں، ملک کے عام حالات انہی کے تابع ہوتے ہیں۔ انہی کے نتائج سے ملکی نظم و نسق کا سر رشتہ وابستہ ہے اس لیے کوئی قوم جو زندگی سے دست برداری کا فیصلہ نہ کر چکی ہو وہ انہیں اپنے لیے تماشا نہیں بنا سکتی اور نہ اس سے بے تعلقی اور بے توجہی اختیار کر سکتی ہے۔ اور ہندوستان میں تو انتخاب کا معاملہ مسلمانوں کے لیے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ انتخابات میں حصہ لینے والی متعدد پارٹیاں ایسی ہیں جن کی انتخابی دلچسپی زیادہ تر مسلمانوں ہی کے پیش نظر ہے اور مسلمانوں کے لیے کچھ خصوصی فیصلے، ان کے انتخابی نقطۂ نظر کا اہم جز ہیں، اور یہ بات تو بلا استثنا ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ جن نظاموں کو اپنا کر میدانِ انتخاب میں اتر رہی ہیں وہ نظامہائے حیات ہیں جن کا اسلام کے پیش کردہ نظام حیات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور ان میں سے کسی کی کامیابی کا بھی مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے تو زندہ رہیں لیکن ان کی اسلامی اور ملی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

بے تعلقی علاج نہیں ہے۔

ہمیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ تقسیم

کے بعد ملک کے حالات کچھ ایسے رہے ہیں کہ ان کی وجہ سے مسلمان سخت اضمحلال اور پژمردگی کا شکار ہیں اور اس پژمردگی نے ان کو ایک خاص طرح کے چڑچڑے پن میں مبتلا کر دیا ہے جس کی وجہ سے ان کا حال بعینہٖ اس بچہ کا سا ہو گیا ہے جو والدین کی سختی یا کسی اور کے کسی ناروا سلوک سے خفا ہو کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور پھر سمجھانے والوں کی منت وسماجت پر بھی اٹھنے کا نام نہیں لیتا بلکہ اور زیادہ غصہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ نوچنے لگتا ہے۔ ان کی اس کیفیت کا ہمیں اندازہ ہے اور ہم اس کو ایک حد تک حالات کا قدرتی نتیجہ بھی سمجھتے ہیں ـــــ اس طرح کے حالات میں جو قوم بھی مبتلا ہو گی ان کا کم وبیش ان کیفیات میں مبتلا ہو جانا ایک ناگزیر امر ہے۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے اور ہم اس پر مسلمانوں کو مستحقِ تعریف سمجھتے ہیں کہ ان حالات کا وہ کم سے کم اثر انھوں نے قبول کیا ہے جو دنیا کی کوئی قوم قبول کر سکتی ہے ـــــ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو غم وغصہ سے بالکل الگ ہو کر اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ان جذبات کے تحت جو رویہ اس وقت اختیار کیے ہوئے ہیں وہ ان کی مشکلات کے ازالہ کی تدبیر ہے یا وہ آئندہ ان میں اور زیادہ اضافہ کا باعث ہو گا۔ بچے اگر ضد کرتے ہیں تو وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس کے لیے معذور سمجھے جا سکتے ہیں اور شاید ان کا یہ ضد کا رویہ بھی اس اعتماد پر مبنی ہوتا ہے کہ ان کے والدین اور اعزہ ان کو زمین سے اٹھا کر سینے سے لگا لیں گے، لیکن مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کو منانے والا کوئی نہیں ہے، اس لیے ان کو ضد کی بجائے

خود سوچ سمجھ کر ایسا رویّہ اختیار کرنا چاہیے جس میں ان کا فائدہ ہو ورنہ ان کو روٹھے ہوئے چھوڑ کر آگے بڑھنے والے آگے بڑھ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ وہ ان کو بیٹھا ہوا دیکھ کر اور دو چار ٹھوکریں رسید کر دیں۔ یہ دنیا بیٹھ رہنے کی جگہ نہیں ہے، یہ کشمکش کا مقام ہے، اس لیے مسلمانوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ حالات جس انداز پر چل رہے ہیں چلتے ہی رہیں گے۔ ان کی علیحدگی سے کوئی کام بند نہیں ہو جائے گا اس لیے انھیں جو کچھ کرنا ہے اسے کرنے کی فکر کرنی چاہیے ورنہ بعد کو پچھتانے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

کام کے غلط نقشے

مسلمانوں کی اکثریت کا عام طرزِ عمل تو وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی جمود و خمود اور معاملاتِ زندگی سے بے تعلقی لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو معاملات و مسائل میں حصہ لے رہے ہیں یا لینا چاہتے ہیں لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اب تک اپنے کام کے جو نقشے تیار کیے ہیں وہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے انتہائی مہلک اور اسلامی نقطۂ نظر سے حد درجہ غلط ہیں۔

قومی تنظیم

کچھ لوگ اس انداز میں سوچ رہے ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ انتخابات کا زمانہ جتنا قریب آتا جائے گا اس طرح سے سوچنے والوں کی تعداد بڑھتی جائے گی کہ اس وقت سب سے مقدم کام مسلمانوں کی قومی تنظیم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانیاں پیش آرہی ہیں وہ قومی تنظیم کے فقدان کا براہِ راست نتیجہ ہیں اور آئندہ کے لیے ان کو جو خطرات درپیش ہیں ان کو دفع کے لیے واحد راہِ عمل قومی تنظیم ہے۔ گذشتہ دنوں متعدد مقامات پر مسلمانوں کے کئی کنونشن منعقد ہو چکے ہیں اور۔ جہاں تک ہم نے اندازہ کیا ہے ان میں شریک

ہونے والوں کے ذہن و دماغ پر ــــ یہی احساس سب سے زیادہ چھایا ہوا تھا۔
اور ہمارا خیال یہ ہے کہ جو لوگ اس سے پہلے مسلمانوں کی قومی تنظیم کی تحریک سے وابستہ رہ چکے ہیں ان کی اکثریت زیادہ تر اسی طرزِ عمل کی حامی ہے۔

لیکن ہم نے اس مسئلہ پر جہاں تک غور کیا ہے ہماری قطعی دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر خاص کر ہندوستان کے موجودہ حالات میں انتہائی غلط اور حد درجہ تباہ کن ہے۔

بلاشبہ یہ پسندیدہ بات ہے کہ ہندوستان کے مسلمان متحد ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ بالکل بکھر گیا ہے، وہ انتہائی پراگندگی کی زندگی گذار رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہندوستان میں چار کروڑ کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی بالکل بے وزن ہو کر رہ گئے ہیں اور اس کے باعث وہ طرح طرح کے نقصانات اٹھا رہے ہیں ان نقصانات سے بچنے کے لیے ان کا متحد ہونا ضروری ہے اور آئین کے بموجب ان کو ایسا کرنے کا پورا پورا حق بھی حاصل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ اتحاد و تنظیم اگر خالص قومیت کی بنیاد پر ہوگی اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں پر اس کا دباؤ ڈالا جائے اور ان سے اپنے قومی حقوق کے بارے میں کوئی سودا کیا جائے تو یہ اتحاد و تنظیم ان کے لیے دینی حیثیت سے بھی غلط ہوگی اور اس سے ان کو دنیوی اعتبار سے بھی کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکے گا بلکہ اس سے ان کو سراسر نقصان پہونچنے کا قوی اندیشہ ہے۔

سب سے پہلا سوال جو قابل غور ہے یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی موجودہ

انتشار کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ بات عملاً ممکن بھی ہے؟ ہندوستان کے موجودہ حالات بلاشبہ ان کے اتحاد و تنظیم کے داعی و محرک ہیں چنانچہ اسی بنا پر اس وقت بہتوں کے دلوں میں اس کی خواہش اور امنگ کروٹیں لے رہی ہے لیکن دوسری طرف حالات ہی نے ان کے لیے اس اتحاد و تنظیم میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں مسلمانوں کا حال ایک عرصہ سے یہ ہو رہا ہے کہ ان کا دین کا رشتہ جو اُن کے درمیان حقیقی رابطۂ اتحاد تھا بہت کمزور ہو گیا ہے۔ وہ اللہ کی مضبوط رسی کو چھوڑ کر مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں جن کا کسی ایک نقطۂ اتحاد پر جمع ہونا بہت دشوار کام ہے، بھر اسی کے ساتھ بلکہ اس کے نتیجہ میں ان میں مفاد پرستی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جس کے باعث اسلام یا مسلمانوں کے حقیقی مفاد کی ان کی نگاہوں میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ اگر وقتی جذبات کے تحت جمع بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے کبھی ہوا ہے تو وہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہوتی ہے، جمع ہوتے ہی وہ منتشر ہونے لگتے ہیں اور وہ جمع ہونا بھی اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس پر لفظ اجتماع کا اطلاق صورت کے لحاظ سے تو شاید کسی درجے میں صحیح ہو سکے لیکن حقیقتاً وہ انتشار ہی کی ایک شکل ہوتا ہے کیونکہ وہ حقیقی روح کسی طرح پیدا نہیں ہو پاتی جو اجتماع کا خاصہ ہے اور اسی بنا پر وہ نہ تادیر قائم رہ پاتا ہے اور نہ کسی ناموافق حالت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اور تقسیم کے بعد تو ان کے انتشار کی یہ کیفیت اور زیادہ نمایاں ہو گئی ہے، ان میں کسی طرح کی فکری ہم آہنگی اور یک جہتی موجود نہیں ہے۔ اور

اس وقت ہندوستان کے مخصوص حالات بھی ایسے ہیں جو اس انتشار میں اضافہ کا باعث ہیں۔ اور یہ پچھلے دور کے اسباب و محرکات کے ماسوا ہیں۔ مسلمانوں میں ابن الوقت اور مفاد پرست قسم کے لوگ پہلے بھی تھے لیکن اس وقت حالات ایسے مجبور کن نہیں تھے کہ یہ لوگ اسلام یا مسلمانوں کے ساتھ اپنے تعلق کو چھپائیں اور مصلحتاً بھی ظاہر نہ کر سکیں لیکن اب لوگوں کی مصلحت اندیشیاں ان کو اسی بات پر مجبور کر رہی ہیں۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے بڑے بڑے لوگوں کا یہ شیوہ سا ہو گیا ہے کہ وہ علانیہ اسلام اور مسلمانوں سے اپنی بے تعلقی کا مظاہرہ کریں اور کتنے لوگ تو ایسے ہیں جو محض اظہار بے تعلقی کو کافی نہ سمجھ کر ان چیزوں سے اپنا تعلق قائم کرتے جا رہے ہیں جن سے تعلق کے معنی ترکِ دین کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کی اس حالتِ انتشار کا اندازہ آپ اور باتوں کے سوا صرف اتنی ہی بات سے بخوبی کر سکتے ہیں کہ آج ہندوستان کی کوئی پارٹی نہیں ہے جس میں مسلمان شریک نہ ہوں، حد یہ ہے کہ ہندو مہاسبھا کے جنرل سکریٹری کے بیان کے مطابق بہت سے مسلمان ہندو مہاسبھا میں بھی شریک ہو رہے ہیں جس کے مقاصد و عزائم مسلمانوں کے لیے کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہیں۔ گویا مسلمانوں کی حیثیت اس وقت یہ ہو گئی ہے کہ نہ ان کا خود اپنا کوئی وجود ہے اور نہ کوئی مخصوص مطمح نظر، وہ ہر اس پارٹی کے ممبر بن سکتے ہیں جس کی ممبری ان کے سامنے پیش کی جائے اور جس کے ذریعہ ان کے خیال کے مطابق انھیں کوئی چھوٹے سے چھوٹا دنیاوی فائدہ پہونچ سکتا ہو، پس جب حالت یہ ہو تو آپ کے پاس

آخر وہ کون سی تدبیر ہے جس کے ذریعہ آپ یہ توقع کر سکتے ہوں کہ مسلمان مستقلاً نہ سہی انتخاب کی عارضی مدت ہی کے لیے۔ کم از کم انتخاب سے فائدہ اٹھانے کے خاطر مجتمع ہو سکیں گے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مسلمان اپنی اندرونی کمزوریوں اور بیرونی موانع کے باوجود متحد ہو سکتے ہیں تو بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جہاں تک الیکشن کا تعلق ہے اور جس پر غور کرنا اس وقت اصل مقصود ہے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ تنظیم مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید ثابت ہو سکتی ہے

قومی تنظیم اور الیکشن انتخاب میں حصہ لینے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان بحیثیت جماعت الیکشن میں حصہ لیں، اور اپنے طور سے اپنے اُمیدوار کھڑے کریں۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں مسلمان شاید ایک دو نشستیں بھی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ ہندوستان کا آئندہ انتخاب جداگانہ طرز کی بجائے مخلوط بنیاد پر ہوگا جس میں کسی اُمیدوار کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اسے غیر مسلموں کی تائید و حمایت حاصل ہو کیونکہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی حلقۂ امیدواری ایسا ہوگا جس میں مسلمانوں کی اتنی اکثریت ہو کہ وہ تنہا اپنے ووٹوں کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کر سکیں۔ اور موجودہ حالات میں غیر مسلموں کے ووٹ اگر کسی مسلم امیدوار کو مل بھی سکتے ہیں تو وہ یقیناً وہ نہیں ہوگا جس کی تائید مسلمانوں کی کوئی تنظیم کر رہی ہو، یہ چیز عام غیر مسلموں کے نزدیک اس امیدوار کی نالائقی کی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔ ان کا ووٹ اگر کسی مسلمان کو مل سکے گا تو وہ ایسا ہی مسلمان ہوگا جو مسلمانوں سے اپنا رشتہ ناتہ منقطع کر چکا ہو، اور اس کے دلائل و شواہد بھی اپنے ساتھ

رکھتا ہو اور ایسے امیدواروں کا مل جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ہم میں ایسے لوگوں کی کمی یوں بھی نہیں ہے اور اگر ہو تو ضرورت پڑنے پر اس کا انتظام بآسانی ممکن ہے اور ضرورت بہر حال ہوگی کیونکہ جب تک کچھ مسلمانوں کے نام ممبران کی فہرست میں شامل نہ ہوں گے، ہندوستان کے سیکولرزم کا روپ ناقص رہ جائے گا۔ اس لیے ایسے امیدوار ہر قیمت پر فراہم کیے جائیں گے۔

دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان اپنے امیدوار علیحدہ نہ کھڑے کریں بلکہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کر لیں اور پھر اس کے ساتھ مل کر الیکشن جیتنے کے لیے جدوجہد کریں۔

اگر یہ صورت ممکن العمل ہو تو مخلوط انتخاب کی حالت میں بلاشبہ یہ صورت مسلمانوں کے لیے کچھ مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن اس کا ممکن العمل ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے اس میں رکاوٹ صرف یہی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یا ان کی اکثریت کسی ایک پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ پر متفق نہیں ہو سکتی بلکہ خود ان پارٹیوں کی طرف سے اس کے لیے آمادگی ایک بڑی مشکل بات ہے۔ یہ پارٹیاں بلاشبہ اس وقت آپ کی حمایت و تائید کی بھوکی ہیں اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندو مہاسبھا تک نے بھی اپنا دروازہ مسلمانوں کے لیے کھول دیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو ان کی ذہنیت کا اندازہ ہو تو آپ بآسانی محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی تائید حاصل کرنے کے لیے آپ کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں جو مسلم قوم کے لیے بحیثیت قوم کچھ سودمند ہو۔ ان کی اولین کوشش تو یہ ہوگی کہ وہ گرہ سے کچھ خرچ کیے بغیر محض ڈرا دھمکا کر آپ کے ووٹ حاصل کر لیں۔

لیکن اگر آپ جرأت سے کام لیں گے اور اُن کی دھمکیوں میں نہیں آئیں گے تو پھر وہ آپکے آپ کے ووٹوں کی زیادہ سے زیادہ جو قیمت دیں گے وہ چند خوشامدانہ الفاظ ہونگے یا مستقبل کے کچھ زبانی یا کاغذی وعدے، جن کی اہمیت زیادہ سے زیادہ انتخاب کے زمانہ تک باقی رہے گی اور اس کے بعد وہ حوالۂ طاقِ نسیاں ہو جائیں گے۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ پارٹیاں آپ کے ساتھ جو کچھ بھی سودا کرنا چاہیں گی وہ مسلمانوں کی قومی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ ہندوستان کی تمام پارٹیاں خواہ وہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیاں ہی کیوں نہ ہوں، اگرچہ متعدد امور میں باہم مختلف ہیں لیکن اس ایک نقطہ پر وہ سب متفق ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی معاملہ ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر نہ کیا جائے اور اس کے وجوہ بالکل ظاہر ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہاں کی ہر پارٹی خواہ وہ اپنے کو کیسے ہی عالمگیر و ہمہ گیر اصولوں کی حامل کیوں نہ ٹھہراتی ہو، "ایک قومی نظریہ" کی اپنے مخصوص مفہوم کے ساتھ، دل سے حامی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر کوئی معاملہ کرنا اس نظریہ کے سراسر منافی ہے، ان میں سب سے زیادہ وسیع ظرف رکھنے والے بھی اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی قومی وجود ہو اور مسلمان ان پر اس کا کوئی معمولی دباؤ بھی ڈال سکیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایسا کرنا کھلے طور پر ایک بے اصولا پن ہے یہ پارٹیاں بہرحال اپنے سامنے کچھ نہ کچھ اصول و مقصد رکھتی ہیں جن کو وہ حتی الوسع نباہنا چاہتی ہیں، وہ اگر اپنے اصول او رمقصد کو چھوڑ سکتی ہیں تو اسی وقت جب اس سے کوئی بڑا فائدہ مقصود ہو، مثلاً سننے میں آرہا ہے کہ بعض مشہور اصولی جماعتیں

الیکشن جیتنے کی خاطر ایسی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد عمل کرنے پر آمادہ ہیں جن کے درمیان کسی تیسری پارٹی کی مشترکہ دشمنی اور مخالفت کے سوا اور کوئی رشتۂ اتحاد نہیں ہے لیکن ظاہر ہے مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کی نوعیت یہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اس قسم کے کسی سمجھوتے سے کسی پارٹی کو جتنا فائدہ پہونچ سکتا ہے اس سے زیادہ نقصان پہونچنے کا احتمال ہے مسلمانوں کے ساتھ قومی بنیاد پر سمجھوتہ کر کے کوئی پارٹی الیکشن جیتنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ سمجھوتہ بجائے خود اس پارٹی کی "قومی غدّاری" کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا اور یہ بات اسے الیکشن میں لے ڈوبے گی ایسی حالت میں عقلمندی کا تقاضا ہر پارٹی کے لیے یہی ہے کہ وہ سختی سے اپنے اصولوں پر جمی رہے۔ اور ان میں کوئی لچک پیدا نہ ہونے دے۔ الیکشن کا زمانہ کیسے ہی جنون کا زمانہ کیوں نہ ہو کوئی پارٹی الیکشن جیتنے کے شوق میں اتنی دیوانی نہیں ہو سکتی کہ وہ مسلمانوں کے تھوڑے سے ووٹوں کے لیے یہاں کی اکثریت کو اپنا مخالف اور دشمن بنالے، لیکن اگر کوئی پارٹی ایسی نکل بھی آئے جو اس دیوانگی کے لیے آمادہ ہو تو اس سے بھی بڑی دیوانگی یہ ہوگی کہ آپ کسی ایسی دیوانہ پارٹی کے ساتھ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کریں۔ اس صورت میں اگر مسلم قوم کا بیڑا خدانخواستہ کل ڈوبنے والا ہوگا تو آج ہی ڈوب جائے گا۔

قومی تنظیم سے الیکشن میں فائدہ اٹھانے کی تیسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان متحد ہونے کے بعد اگر بحیثیت قوم کسی پارٹی سے کوئی سمجھوتہ نہ کر سکیں تو کسی منظم طریق کے مطابق وہ الگ الگ ٹولیوں میں مختلف پارٹیوں میں شریک ہوں، اور اس پارٹی کو کامیاب بنانے میں حصہ لے کر اس کی فتوحات میں ساجھی بنیں۔

یہ صورت دیکھنے میں بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس کی گہرائیوں میں اتر کر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اول تو یہ صورت بھی ناقابلِ عمل ہے اور دوسرے اس سے مسلمانوں کو بحیثیت قوم کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ناقابلِ عمل اس لیے کہ ایک طرف مسلمان افراتفری کے شکار ہیں، نہ وہ متحد ہو سکتے ہیں اور نہ ان میں بحالاتِ موجودہ اس کی صلاحیت ہی ہے کہ وہ منظم طور پر اس تدبیر کو زیرِ عمل لائیں، دوسری طرف یہ کام بھی چونکہ مسلم قوم کی قومی تنظیم ہی کا ایک شاخسانہ ہے اس لیے اس کے ساتھ ان پارٹیوں کا طرزِ عمل وہی ہوگا جو اس سے پہلے اجتماعی سمجھوتہ اور تعاون کے ضمن میں گذر چکا ہے اس لیے اس کا نتیجہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہو سکتا۔

اور غیر مفید اس لیے کہ ان دونوں باتوں کی موجودگی میں اس تدبیر کی جو عملی شکل ہوگی وہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ان پارٹیوں میں مسلمان محض اپنی انفرادی حیثیت میں شریک ہوں اور وہاں پہنچ کر اپنے طور پر اسلام یا مسلمانوں کی کوئی خدمت بجا لائیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی یہ انفرادی شرکت مسلمانوں کے عمومی فائدے کے لحاظ سے بالکل ہی بے سود ثابت ہوگی۔

کسی پارٹی میں کسی مسلمان کی شرکت خواہ وہ عارضی طور سے انتخاب ہی کی خاطر کیوں نہ ہو کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے کہ آپ نے اس کا ارادہ کیا اور یہ پورا ہو گیا۔ اس کے لیے آپ کو سب سے پہلے امتحان و آزمائش کی ایک کڑی منزل سے گذرنا ہوگا۔ یہ اللہ کا دین تو ہے نہیں جس میں شرکت بہت آسان ہو گئی ہے، یہ پارٹیوں کا معاملہ ہے جو دکھاوے ہی کے لیے سہی بہر حال اپنے

سامنے کچھ اصول و مقاصد رکھتی ہیں اور جب تک ان کو کسی کے بارے میں یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ دل سے ان کے اصول و مقاصد کا ماننے والا ہے، آسانی کے ساتھ اپنا دروازہ اس کے لیے کھول نہیں سکتیں۔ اور خاص کر ایک مسلمان کے حق میں تو وہ اس احتیاط کی بہت زیادہ ضرورت محسوس کرتی ہیں کیونکہ مسلمانوں کے بارے میں وہ پہلے ہی سے یہ بدگمانی یا خوش گمانی رکھتی ہیں کہ وہ ان کے اصولوں سے زیادہ اسلام کے اصولوں کا پابند ہوگا اس لیے کافی چھان بین اور آزمائش کے بعد وہ کسی مسلمان کو اپنے اندر گھسنے کی اجازت دے سکتے ہیں اور اس کے بعد بھی وہ آخر وقت تک اس سے مطمئن نہیں ہو سکتیں اس لیے تحقیقات اور آزمائشوں کا سلسلہ داخلہ کے بعد بھی ختم نہیں ہو جائے گا، نئے نئے سوالات اور مواقع، خلوص و وفاداری کی جانچ کے لیے برابر سامنے آتے رہیں گے۔

پھر داخلہ کے بعد ہر مسلمان ممبر کو پارٹی ڈسپلن کا پورا پورا پابند ہونا پڑے گا کوئی ممبر پارٹی کے فیصلوں سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا ورنہ اس کی کم از کم سزا اخراج ہے۔ گویا کسی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد آپ کی پوری حیثیت پارٹی میں ضم ہو جائے گی، یہاں تک کہ آپ اپنے زبان و دل کے بھی مالک نہیں رہیں گے۔ ایسی حالت میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ انفرادی حیثیت میں کسی پارٹی میں شریک ہو کر اسلام یا مسلمانوں کے فائدے کے لیے کیا کام کر سکتے ہیں، اِلّا یہ کہ آپ اپنے اندر اتنی قوت رکھتے ہوں کہ آپ اس پارٹی کو بنیادی طور سے بدل ڈالیں لیکن کوئی احمق

ہی ہوگا جو موجودہ حالات میں اس کے امکان کا تصور بھی کر سکے، یہ تو خیر دور کی بات ہے، آپ کو اکثر حالات میں تو شاید یہ دیکھنا پڑے گا۔ جیسا کہ اس وقت عملاً دیکھا جا رہا ہے۔ کہ محض مسلمان ہونے کی بنا پر آپ اپنے دوستوں کی نگاہوں میں کچھ کھٹک تو نہیں رہے ہیں اور پھر اگر آپ کو اس پارٹی میں رہنا ہے تو اس طرح کے شبہوں کو رفع کرنے کے لیے آپ کو ایسی حرکتیں کرنی پڑیں گی جو اسلام یا مسلمانوں کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوں۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ جب اپنی وفاداری کا پورا پورا امتحان دے چکیں اور اس میں سو فیصدی کامیاب ہو جائیں تو آپ اس پارٹی کی طرف سے الیکشن میں امیدوار بنا کر کھڑے کر دیئے جائیں بلکہ اگر آپ کا نصیب زور آور ہوگا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الیکشن میں اس پارٹی کے کامیاب ہو جانے پر آپ کو کوئی عہدہ و منصب بھی حاصل ہو جائے لیکن یہ یاد رکھیے کہ یہ سب عنایتیں آپ کے "لایق" ہونے کی شرط پر ہوں گی نہ کہ اس بنا پر کہ آپ مسلمان ہیں اور ان عنایتوں سے آپ شخصی طور سے متمتع ہو سکیں گے، اس سے آپ اسلام یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکیں

مذکورہ بالا باتوں کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو آپ پر یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی قومی تنظیم، واقعات و تجربات کی روشنی میں کتنی غلط اور بے نتیجہ ہے اور اس سے ان کو نہ دین کا کوئی فا[ئدہ] پہونچ سکتا ہے اور نہ دنیا کا لیکن اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے میں آپ

توجہ ایک اور اہم بات کی طرف بھی مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ان باتوں سے قطع نظر کہ بحالات موجودہ قومی تنظیم کی نازک بیل کا منڈھے چڑھنا ممکن بھی ہے یا نہیں اور اس کے ذریعہ ہم الیکشن میں کوئی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں ہمارے لیے سب سے زیادہ قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ قومی تنظیم کے جو تلخ تجربات ہم نے اٹھائے ہیں، جن کا ایک حصہ ہماری موجودہ مشکلات و مصائب بھی ہیں، ان کے بعد اب دوبارہ اس کا تجربہ کرنا ہمارے لیے کہاں تک مناسب ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ہندوستان میں جو ہندو مسلم کشمکش پیدا ہو گئی ہے اور جس میں خود ہماری غلط کاریوں کا بھی کافی دخل ہے، اس کا ختم ہونا اسلام کے لیے بھی مفید ہے۔ کیونکہ اس کشمکش نے غیر مسلموں کے دل و دماغ کا دروازہ اسلام کے لیے بند کر دیا ہے۔ اور یہ مسلمانوں کے دنیاوی فائدوں کے اعتبار سے بھی ضروری ہے کیونکہ ہندوستان میں جہاں تقسیم کے بعد مسلمانوں کی حیثیت ایک قابلِ رحم اقلیت کی ہو گئی ہے، یہ کشیدگی ان کے لیے مستقل نقصانات و خطرات کا موجب ہوگی نہ کہ کسی خیر و فلاح کی اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قومی بنیادوں پر مسلمانوں کی تنظیم اور قومی حقوق کے لیے ان کی کشمکش کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی میں اور زیادہ اضافہ ہو۔

اور اس سے بھی اہم بات ایک اور ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے بھی عرض کر دوں۔ کہ کیا قومی تنظیم کے مسئلہ پر غور کرتے وقت

کبھی آپ نے اس سوال پر بھی غور فرمایا ہے کہ دنیا میں آپ کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا محض یہ کہ آپ بھی دنیا کی اور قوموں کی طرح کی ایک قوم ہیں، اس لیے انہی کی طرح بالکل قومی بنیادوں پر آپ کو اپنی تنظیم کی فکر کرنی چاہیے؟ یا یہ ہے کہ آپ ایک اصولی جماعت ہیں جو دنیا میں خدا کا آخری پیغام اپنے قول و عمل کے ذریعہ پیش کرنے کے لیے مبعوث کی گئی ہے؟ اگر فی الواقع آپ کا خیال یہی ہے کہ آپ ایک قوم ہیں تو ضرور اپنی تنظیم انہی اصولوں پر کیجیے جو اور قوموں کے سامنے ہیں اور اس راہ کی کسی مشکل یا خطرہ کی کوئی پرواہ نہ کیجیے لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ آپ اپنے کو قوم کی بجائے حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) سمجھتے ہیں تو ضروری طور پر آپ کو اپنا زاویہ نظر اور طریق کار سب کچھ بدلنا پڑے گا اور اس تبدیلی کے بعد قومی تنظیم کے بارے میں آپ کا موجودہ نقطۂ نظر خود بخود بدل جائے گا

سیاسی پارٹیوں میں شرکت

مسلمانوں میں سوچنے اور کام کرنے والوں کا ایک دوسرا طبقہ وہ ہے جو قومی تنظیم کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر کا تو حامی ہے، وہ اس کو ناممکن بھی سمجھتا ہے اور مسلمانوں کے لیے تباہ کن بھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لیے اور خاص طور سے انتخابات سے فائدہ اٹھانے کے لیے، ملک کی کسی نہ کسی پارٹی میں ضرور

شریک ہو جانا چاہیے چنانچہ انھوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق ان جماعتوں میں سے کسی نہ کسی کو اپنے لیے منتخب بھی کر لیا ہے اور اب ان کی کوششیں انہی کی تائید و حمایت کے لیے وقف ہیں۔ ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ جب ہم ملکی سیاست سے الگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتے اور نہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے تحت اپنی کوئی جداگانہ تنظیم قائم کر سکتے ہیں تو اس کے سوا ہمارے لیے چارہ کار ہی کیا ہے کہ ہم جس پارٹی کی شرکت کو اپنے لیے زیادہ مفید خیال کریں اس میں شریک ہو جائیں۔ اس طرزِ فکر کے حامیوں میں ایک طبقہ تو ان مسلمانوں کا ہے جن کا رشتہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یا تو پہلے ہی سے بہت کمزور ہو چکا تھا اور وہ محض ظاہرداری کے طور پر، یا جرأت کی کمی کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے اپنے تعلق کو نباہ رہے تھے یا تقسیم کے بعد یہاں کے حالات نے ان کو ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں اس لیے یہ طبقہ بغیر کسی ذہنی خلش کے ان پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کا حامی و ہمنوا بن گیا ہے اور ذاتی طور سے وہ اس کو مفید سمجھتے ہوئے اس پر مطمئن ہے۔ رہا اسلام یا مسلمانوں کا فائدہ تو گو اس کو اس سے کچھ سروکار نہیں ہے لیکن ان کے ساتھ اپنے ظاہری تعلق کو بنائے رکھنے کے لیے وہ کبھی کبھی اس پہلو سے بھی اس شرکت کے فوائد پر وعظ کہہ دیا کرتا ہے۔

اس طرح کے لوگ اس وقت ہمارے مخاطب نہیں ہیں جن لوگوں کو فی الواقع نہ اسلام کے فائدہ و نقصان سے کوئی لگاؤ ہو اور نہ مسلمانوں کے فائدہ و نقصان سے، امر جن کے سامنے زیادہ تر اپنی ذاتی عزت و سربلندی ہو اور بس، ایسے

لوگ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ہندوستان میں اسلام یا مسلمانوں کو کیا مشکلات درپیش ہیں اور ان کے حل کی صحیح تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس موقع پر ایسے لوگوں سے تعرض کرنا ایک بالکل غیر ضروری بات ہے۔

لیکن مقام حیرت یہ ہے کہ ان ہی لوگوں کے زمرہ میں ہمیں ایسی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں جن کے سروں پر علم و فضل کی دستاریں بندھی ہوئی ہیں اور ان کی زبانیں قَالَ اللہ وَقَالَ الرَّسُوْل کی نغمہ سنج ہیں اور فی الواقع ان کو اسلام اور مسلمانوں سے نہایت گہرا تعلق بھی ہے۔ ایسی محترم ہستیاں جن کا احترام ہمارے دل کے رگ و ریشہ میں سمایا ہوا ہے جب کوئی ایسی روش اختیار کریں جو ہمارے نقطۂ نظر سے صحیح نہ ہو تو ان پر تنقید کرنا ظاہر ہے ہمارے لیے کتنا کتنا مشکل کام ہوگا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں یہ ہماری سخت دینی مداہنت ہوگی اگر ہم ان ہستیوں کے احترام کی وجہ سے ان کے اس رویہ کے بارے میں جسے ہم پوری دیانت کے ساتھ غلط سمجھتے ہیں، اپنے نقطۂ نظر کا اظہار نہ کریں۔ اس لیے ان کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم چند جملے ان کی اس روش کے بارے میں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ان حضرات کا رویہ خواہ کتنے ہی خلوص و دیانت پر کیوں نہ مبنی ہو، دینی اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے غلط اور مسلمانوں کے لئے انتہائی مہلک ہے۔

جہاں تک اس مسئلہ کے دینی پہلو کا تعلق ہے اس وقت اس پر کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے اور نہ اہلِ علم کے تخاطب میں اس کی کوئی خاص ضرورت

ہی ہے۔ وہ خود بادنیٰ توجہ اسے سمجھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان حضرات نے آج سے بہت پہلے، آج سے بالکل مختلف حالات میں، اپنے لیے جو راستہ پسند کیا تھا اس پر اب تک آنکھیں بند کیے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور اس پر دوبارہ نظرِ ثانی کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ یا اگر گستاخی نہ ہو تو ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ اگر ان میں سے کچھ لوگوں کو اس پر کبھی کوئی بے اطمینانی محسوس بھی ہوتی ہے تو اپنی قدیم راہ کا طبعی انس ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے یا ضعفِ ہمت قدم روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور حقیقتاً یہ ذرا ٹیڑھا معاملہ بھی ہے۔ جو آدمی زندگی بھر ایک کام اس اعلان کے ساتھ ساتھ کرتا رہا ہو کہ کرنے کا حقیقی کام یہی ہے اس کے لیے یہ بات کچھ آسان نہیں ہے کہ وہ اس کام کو ترک کر کے اپنی غلطی کا اعتراف کر لے اور نئے راستہ کے اختیار کرنے میں جو دشواریاں ہوتی ہیں انھیں انگیز کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ بہر حال اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ان حضرات کے اپنی روشِ قدیم پر بدستور قائم رہنے کے حقیقی اسباب کیا ہیں اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے البتہ اصولی طور سے ہم اپنے علم کے مطابق یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ روش نہ دین کی حقیقی مصلحتوں اور تقاضوں کے مطابق ہے اور نہ ان کے رتبہ اور ذمہ داریوں ہی کے شایان شان ہے اور یہ بات کسی لمبی چوڑی گفتگو کی بجائے صرف اس مختصر بات سے واضح ہو سکتی ہے کہ ہم اور آپ سبھی جانتے ہیں کہ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو چند عقائد و رسوم تک محدود ہو بلکہ وہ ایک مستقل نظامِ حیات ہے جس کے دائرہ میں تمام انسانی

امور و معاملات داخل ہیں اور ہر وہ شخص جو اسلام کا نام لیوا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ پوری طرح اس نظامِ حیات اور طریقِ زندگی کو عملاً اپنانے اور اس کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اس لیے ایک مسلمان کی حیثیت نہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے کو کوئی قوم سمجھ کر دنیا کی اور قوموں کی طرح قومی بنیادوں پر اپنے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرے اور نہ یہ ہے کہ وہ چند رسوم و عبادات ادا کر کے اپنے دوسرے معاملاتِ زندگی کو اپنے طور سے یا کسی رائج الوقت نظریۂ حیات کے تحت چلانے کے لیے اپنے کو آزاد سمجھ لے۔

اس بنیادی بات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ خود غور کریں کہ آپ کے مسلم ہونے کی یہ حیثیت آپ سے کیا مطالبہ کرتی ہے اور آپ کی روش اس حیثیت کے کہاں تک مطابق ہے کہ آپ دین کے چند احکام پر عمل کر کے اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں کہ آپ اسلام کا حق ادا کر رہے ہیں اور اپنے بقیہ امور و معاملات میں اسلامی ہدایات کو نظر انداز کر کے ان پارٹیوں میں شریک ہو جائیں جن کا نظریۂ حیات آپ کے نظریۂ حیات سے قطعاً مختلف ہے بلکہ اس کی کامل نفی پر مبنی ہے۔

ملک کی موجودہ پارٹیاں اس وقت موقع نہیں ہے کہ ہم ملک کی موجودہ پارٹیوں کے اصول و مقاصد پر کوئی مفصل تبصرہ کریں لیکن چند جملے ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں لکھنا چاہتے ہیں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ان کی شرکت کہاں تک ایک مسلم کی صحیح حیثیت کے

مطابق ہو سکتی ہے۔

سوشلسٹ پارٹی آج ہمارے بہت سے علماء کا بھی مرکز امید ہے، لیکن کیا یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ سوشلزم اپنی بنیاد اور اصول میں اسلام سے قدم قدم پر متصادم ہے۔ اسلام اس کائنات کے لیے ایک خالق کو مان کر اور اس کو انسان کا حقیقی مالک تسلیم کر کے آگے قدم بڑھاتا ہے اور سوشلزم اس دنیا کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتا اور انسان کو اس میں حقیقی فرمانروا کا درجہ عطا کرتا ہے۔ ایک کا مقتدا محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور دوسرا لینن اور اسٹالن کا پیرو ہے، ایک کے لیے صحیفۂ ہدایت قرآن ہے اور دوسرا "دی کیپٹل" سے ہدایت و روشنی حاصل کرتا ہے، ایک کا قبلہ کعبہ ہے اور دوسرا اپنا سرِ عجز و نیاز ماسکو کی طرف جھکاتا ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بکجا۔

اور اسی پر کمیونسٹ پارٹی کو قیاس کر لیجیے جو ان مخصوص معاملات میں اس سے بھی چند قدم آگے ہے۔

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

یہی معاملہ کانگرس کا بھی ہے اس کے اس اعلان کی وجہ سے کہ وہ لادینی جمہوریت کی علم بردار ہے۔ بہت سے مسلمان اسے دیگر جماعتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر اور اپنے دین و مذہب کے لیے بالکل بے ضرر سمجھتے ہیں لیکن ان کا ایسا سمجھنا سادہ لوحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اول تو یہ لادینیت کا تصور خود کانگریس کے دائرۂ عمل میں کاغذی اعلان سے زیادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا جیسا کہ

اس کے اس وقت تک کے کارنامے شاہد ہیں اور دوسرے لادینیت خود ایک دین ہے جس کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان خدائی دین کو چھوڑ کر جمہور کی خدائی کے آگے جھک جائے۔

قابلِ ذکر جماعتوں میں ایک بڑی جماعت ہندو مہاسبھا بھی ہے جس نے انتخاب کے موقع پر نہایت فیاضی کے ساتھ اپنا دروازہ مسلمانوں کے لیے بھی کھول دیا ہے لیکن اس کے بارے میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندو مہاسبھا کے عزائم اور عملی سرگرمیوں سے ہر مسلمان آگاہ ہے، اس لیے اس کے بارے میں بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں شرکت کے اس کے سوا اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی مول لی جائے ہندو مہاسبھا کے نیتوں کا اندازہ صرف اتنی بات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو پارلیمنٹری سرگرمیوں میں تو شرکت کی آزادی عطا فرمائی ہے لیکن اس کے ماسوا وہ کسی اور دائرہ میں ان کے قدم کو آنے دینا نہیں چاہتی گویا ہندو مہاسبھا مسلمانوں سے اس بات کی ضرور خواہشمند ہے کہ وہ آئندہ الیکشن میں اسے کامیاب ہونے میں مدد دیں لیکن وہ ان مقاصد و عزائم میں کسی طرح کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے جو مسلمانوں کو پامال کرنے کے لیے اس نے پہلے سے اختیار کر رکھے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس کی خواہش یہ ہے کہ الیکشن کا لالچ دے کر مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا جائے تاکہ انہی کے حربوں سے ان کا صفایا کیا جا سکے کیا ستم ظریفی کی اس سے بھی نادر کوئی مثال ہو سکتی ہے؟

ہمیں یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہے کہ ہندو مہاسبھا جو نعرے لگاتی ہے ان میں سے بہت سے نعرے ایسے بھی ہیں جن کی واقعی ہمیں قدر کرنی چاہیے مثلاً وہ سیکولرزم کی مخالف ہے اور اس کی بجائے وہ سیاست میں مذہب و اخلاق کے اقدار شامل کرنے کی حامی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ یہ نعرے، جہاں تک عام اندازہ ہے محض سیاسی چال کے طور پر، عوام کو دھوکا دینے اور ان کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانے کے لیے لگا رہی ہے اور واقعی اس کے دل میں ان اَقدار کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ مذہب کے حقیقی تصور ہی سے اب تک ناآشنا ہے۔ ہمارے نزدیک دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہوسکتا جس میں اس جارحانہ قوم پرستی کی گنجائش نکل سکے جس میں ہندو مہاسبھا مبتلا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک طرف وہ مذہب و اخلاق کے بلند بانگ دعوے بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اس پر قوم پرستی کی یہ لعنت بھی مسلط ہے۔

ان مذکورہ بالا جماعتوں کے بعد کوئی اور بڑی جماعت ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کی طرف مسلمان امید کی نگاہ اٹھا سکیں، رہی نئی جماعتیں جو اس وقت انتخاب کے قرب کی وجہ سے برساتی کیڑوں کی طرح ہر روز پیدا ہو رہی ہیں تو ان کے متعلق ہم کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ان جماعتوں کے بانی اور ان میں شریک ہونے والوں میں بہت سے لوگ بہت مخلص ہوں لیکن ان جماعتوں کے بارے میں یہ بات ضروری طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ یہ لوگ مذکورہ صدر جماعتوں ہی کے نظامِ شمسی کے ٹوٹے ہوئے تارے ہیں۔

اس لیے یہ جماعتیں اپنے بنیادی خیالات و تصوّرات کے لحاظ سے اُن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہو سکتیں اور اس لیے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت بھی وہی ہو سکتی ہے جو مذکورہ جماعتوں کی ہے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر غور کرنا چاہیے کہ دینِ اسلام کے پیروجن کی حیثیت خود ایک نظام کے داعی کی ہے، کیا ان کو یہ بات زیب دے سکتی ہے کہ وہ اپنے دین کی پیروی اور اس کی دعوت کا کام چھوڑ کر کسی دوسرے دین کے داعی و مُبلّغ بن جائیں؟ اگر وہ اپنے ضعفِ ہمّت یا حالات کی واقعی ناسازگاریوں کی بنا پر اپنے دین کو قائم کرنے کی جد وجہد سے اپنے کو عاجز و درماندہ پاتے ہیں، تو وہ اپنے گھروں میں بیٹھ رہیں اگر ان کی معذوریاں واقعی ہیں تو امید ہے اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے گا۔ لیکن کیا اس کے لیے بھی وہ کوئی عذر پیش کر سکتے ہیں کہ دینِ حق کی بجائے وہ اس کے مخالف کسی دین کی گاڑی کے قلی بن جائیں اور اس کو کھینچنے میں اپنی محنت و مشقت صرف کریں؟ ہمارے نزدیک تو ایسا کرنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ مسلمان کچھ نہ کریں اور خاموش اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں، ہر چند یہ رویّہ بھی جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، گوناگوں وجوہ سے مسلمانوں کے لیے انتہائی تباہ کن اور غلط ہے لیکن اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہو گا کہ وہ براہِ راست کسی غیر اسلامی حرکت و فعل کے ملزم نہیں بنیں گے، یہ بھی ایمان ہی ایک راہ ہے، گو ادنیٰ اور اضعف ایمان کی، کہ آدمی حق کے لیے کام نہ کر سکے تو کم از کم باطل کا ساتھ نہ دے۔ تو کیا مسلمانوں میں اب اس ادنیٰ و اضعف ایمان کو برقرار رکھنے کی بھی سکت نہیں ہے۔

ملک کی موجودہ پارٹیوں میں شرکت کا یہ دینی نقصان ہے جس کی طرف سرسری طور سے اشارہ کیا گیا ہے لیکن اگر آپ دنیاوی فائدہ و نقصان کے پہلو سے غور کریں گے تو اس پہلو سے بھی اس میں آپ کو اس کے سوا اور کوئی فائدہ نظر نہیں آئے گا کہ آپ کے کچھ لوگ اسمبلیوں میں پہونچ جائیں یا وزارتوں کی گدّی انھیں میسّر آجائے، لیکن یہ جو کچھ فائدے حاصل ہوں گے افراد کے لیے ہوں گے، امتِ مسلمہ کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ یہ بات اس تفصیل سے بھی واضح ہو سکتی ہے جو ہم نے اوپر قومی تنظیم اور الیکشن کے ضمن میں پیش کی ہے اور اس وقت کے حالات بھی اس کا بیّن ثبوت ہیں اور اس پر مزید بحث انشاء اللہ آگے آئے گی۔

بہرحال اس وقت مسلمانوں کے سوچنے اور کام کرنے کے یہی دو نقشے ہیں جن کے سلسلہ میں ہم نے اپنا نقطۂ کسی قدر تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا ہے۔ آپ بھی اس پر غور فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ کیا واقعی ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے بس یہی دو راہیں کھلی ہوئی ہیں جو دونوں ہلاکت و بربادی کی راہیں ہیں یا ان کے علاوہ ان کے لیے کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا ہے جس کو اختیار کر کے وہ دین و دنیا دونوں کے نقصانات سے بچ سکیں اور ساتھ ہی وہ اس ملک کی بھی خدمت بجا لا سکیں جس میں وہ رہتے ہیں اور جس میں رہنے کی وجہ سے ان پر اس کی خدمت کی بھی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اس سوال کا جواب بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ بحالاتِ موجودہ مسلمانوں کا عام خیال یہی ہے کہ ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں تیسری کوئی راہ نہیں یا تو سب کچھ چھوڑ کر خاموش بیٹھے رہیں اور انقلاباتِ زمانہ کا تماشا دیکھیں یا

اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو قومی بنیادوں اپنی جداگانہ تنظیم کریں یا موجودہ پارٹیوں ہی میں سے کسی پارٹی کا ساتھ دیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا سمجھنا محض کوتاہ اندیشی ہے۔ ان دونوں راستوں کے علاوہ ایک راستہ اور بھی ہے اور وہی مسلمانوں کے لیے حقیقی نجات وسعادت کا راستہ ہے، اور اگر وہ اس وقت ان کو نظر نہیں آرہا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے حالات ہی ایک عرصہ سے ایسے رہے ہیں کہ ان میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نظر ہی نہ آسکے خواہ وہ اپنی جگہ کتنا ہی واضح اور روشن کیوں نہ ہو۔

آئیے آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس کوتاہ نظری کے اسباب کا بھی کچھ جائزہ لے لیں کیونکہ اس کے بغیر ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اسلام کی حقیقت اور مسلمانوں کا عمومی حال

اسلام دنیا کا وہ مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے کو بالکلیہ خدا کے حوالہ کر دیں بلکہ لفظ اسلام کے لغوی معنی بھی کامل حوالگی ہی کے ہیں اور یہی اس کا شرعی مدلول بھی ہے۔

پھر اسلام وہ مذہب ہے جس نے وضو اور طہارت سے لے کر سیاست وحکومت اور بین الاقوامی معاملات وتعلقات تک غرض جملہ امور ومعاملات زندگی کے بارے میں نہایت واضح ہدایات دی ہیں اور یہ اس کے آخری مذہب ہونے کا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا	آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کی تکمیل کر دی اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو بطور ایک دین کے پسند کر لیا۔

اور یہ ہدایات دے کر وہ اپنے ماننے والوں کو اس بات کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیتا کہ وہ اس مجموعہ ہدایات سے کچھ چیزیں از قسم عبادات وغیرہ الگ کر لیں اور ان کو ادا کر لینے کے بعد اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں کہ انھوں نے اس کے ماننے کا حق ادا کر دیا بلکہ وہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی جملہ ہدایات

کو نہ صرف خود پوری طرح اپنانے کی کوشش کریں بلکہ ان کو دوسروں تک پہونچانے کی بھی پوری سعی کریں کہ اس کے بغیر مومن ہونے کا تقاضا پورا نہیں ہو سکتا۔

لیکن بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اسلام کی اس حقیقت کو زبانی طور سے تو ایک حد تک تسلیم کرتے رہے لیکن عملاً اس کو قائم کرنے کی انھوں نے کچھ زیادہ پروا نہیں کی۔ مجموعہ دین کے کچھ اجزا جن کو انھوں نے نسبتاً آسان یا مفید پایا ان کو تو انھوں نے مضبوطی سے پکڑے رکھا لیکن دوسرے اجزاء کو جو دین میں کافی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ کچھ ایثار و قربانی اور مشقت کے بھی طالب ہیں، ان کو وہ یکے بعد دیگرے چھوڑتے چلے گئے۔

مسلمان اس ملک میں زیادہ تر فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اور جب تک ان کی حکومت قائم رہی حکمرانی کے افکار و مشاغل ہی ان کی توجہات کا مرکز بنے رہے جس میں انھیں اس بات کا بہت کم موقع ملا کہ وہ اسلام کو بحیثیت نظامِ زندگی خود اپنائیں اور دوسروں تک اس کے پیغام کو ٹھیک ٹھیک پہنچا دیں۔ تاریخ کے پچھلے ادوار میں بلاشبہ ہمیں ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جنھوں نے دین کی صحیح حیثیت کو خود اپنانے کی کوشش کی اور اس کو عملاً قائم کرنے کے لیے بھی انھوں نے جد و جہد کی لیکن جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں یہ کہنا بلا مبالغہ صحیح ہوگا کہ یہ چیز عمومی طور سے ان کے پیش نظر نہیں رہی ہے۔

اس غفلت و کوتاہی کا جہاں یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مسلمانوں کی وہ اجتماعی

قوت جو دین کی پیدا کردہ تھی رفتہ رفتہ مضمحل ہوتی گئی ـــــ کیونکہ دین کو جزئی طور سے اپنانے سے وہ مسلمان تو باقی رہ سکتے تھے لیکن ان میں وہ باتیں پیدا نہیں ہو سکتی تھیں جو کل دین کو بحیثیت نظامِ زندگی اختیار کرنے سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے وہ طرح طرح کی کمزوریوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے جو بالآخر انقلابِ حکومت کا باعث بنا، اور دوسری طرف اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود دین کا تصوّر رفتہ رفتہ محدود سے محدود تر ہوتا چلا گیا۔ پھر چونکہ دین کے تمام اجزاء باہم مربوط ہیں اور وہ اسی وقت تک اپنی اصلی شکل میں زندہ و قائم رہ سکتے ہیں جب تک کہ ان کا باہمی ارتباط قائم رہے اس لیے اس محدودیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جن باتوں کو باقی و برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ باتیں بھی اگر باقی رہیں تو اپنی بہت کچھ معنویت کھو کر۔

انقلابِ حکومت کے بعد دین کو بحیثیت نظامِ زندگی اختیار نہ کرنے کے یہ دو زبردست نقصانات تھے جو مسلمانوں کو پیش آئے ـــــ اجتماعی اوصاف و خصوصیات سے محرومی اور دین کے تصوّر کا محدود ہوتا چلا جانا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جب نتائج کھل کر سامنے آرہے تھے تو ان کے تدارک کی بروقت کوشش کی جاتی لیکن یا تو اس کے لیے کوئی موثر کوشش عمل میں نہیں لائی گئی یا لائی گئی تو اس کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس وقت مسلمانوں میں اگر دینی حس بیدار رہا ہوتا تو انقلابِ حکومت کا واقعہ ان کے لیے تازیانۂ عبرت کا کام دے سکتا تھا اور حقیقتاً عالم کے

انقلابات اسی لیے ہوا کرتے ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝	انسان کی اپنی کرتوتوں کی بدولت خشکی و تری میں فساد پھیل گیا تاکہ اللہ ان کے بعض اعمال کا نتیجہ انھیں چکھا دے شاید وہ (اپنی روش سے) باز آجائیں۔

لیکن چونکہ دین کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ پہلے ہی بہت کچھ مضمحل ہوچکا تھا اور عبرت اور اثر پذیری کے لیے تعلق باللہ کی جو کیفیتیں مطلوب ہیں ان سے مسلمانوں کا دل پہلے ہی بہت کچھ خالی ہوچکا تھا اس لیے اس انقلاب عظیم کا بھی ان پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ تھوڑے دنوں تک ان پر حیرانی و سراسیمگی کی کیفیت تو ضرور طاری رہی کیونکہ یہ جو کچھ پیش آیا وہ عام لوگوں کے لیے ایک بالکل غیر متوقع صورتِ حال تھی اور ان میں جو نرم دل تھے انھوں نے اس پر حسرت واندوہ کے آنسو بھی بہائے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد یہ کیفیت جاتی رہی اور پھر سب کچھ بھلا کر عام طور سے مسلمان اسی راستے پر چل پڑے جس کو محکوم قومیں ہمیشہ سے اختیار کرتی چلی آرہی ہیں یعنی غالب قوم کی پیروی۔ اس چیز نے دین کے ساتھ ان کے لگاؤ کو زیادہ مضمحل و کمزور کردیا۔ انگریز توپ و تفنگ ہی کے ساتھ نہیں آئے تھے بلکہ وہ اپنے ساتھ جسموں سے زیادہ قلوب واذہان کو مسخر کرنے والی ایک چمکتی ہوئی تہذیب بھی لے کر آئے تھے جو دیکھنے میں تو بڑی ہی خوشنما اور دل فریب تھی لیکن وہ اپنی روح و مزاج کے اعتبار سے اسلام اور اسلامی تہذیب کے لیے سمِ قاتل تھی کیونکہ

اس کی بنیاد، خدا کے انکار یا اس سے بے نیازی پر قائم تھی اور اگر اس میں مذہب کے لیے کوئی گنجائش تھی تو محض اس حد تک کہ وہ انسان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک حقیر گوشہ ہے جس کو باقی رکھنا بھی چنداں ضروری نہیں ہے۔ یہ تہذیب چونکہ حکمراں قوم کی تہذیب تھی اور مسلمان اپنی ملّی خصوصیات سے بڑی حد تک پہلے ہی عاری ہو چکے تھے اس لیے ان کی اکثریت نے لبیک کر اس کا خیر مقدم کیا اور اس بارے میں علماء اور خاص طور سے بانیانِ دارالعلوم دیوبند کی مخالفتوں کی بھی انھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور پروا کر بھی کیسے سکتے تھے جبکہ صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں ان کے دل دین اور علمبردارانِ دین کے حقیقی احترام سے خالی ہو چکے تھے اور اس کے مقابلہ میں دنیا ان کی نگاہوں میں مرغوب ہو چکی تھی جس کا حصول انگریزی تہذیب و تعلیم کے ساتھ نہایت حکمت عملی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی کچھ ہی دنوں بعد مسلمان اندر اور باہر دونوں حیثیتوں سے بدلنا شروع ہو گئے یہاں تک کہ بہت سے لوگ تو ظاہری طور سے انگریز بن گئے اور بہت سے اپنی ظاہری حیثیت میں تو مسلماں باقی رہے لیکن "لارڈ مکالے" کے بقول ان کا ذہن و دماغ بالکل انگریزی تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھل گیا یہاں تک کہ جب ان کو اسلام یا مسلمانوں کے سلسلہ میں یہاں کی اکثریت کے طرزِ عمل سے خطرہ محسوس ہوا اور اس کو روکنے کے لیے انھوں نے بند لگانا چاہا تو اس کے لیے اینٹ اور گارا انھوں نے یورپ ہی کے کارخانوں کا تیار کیا ہوا فراہم کیا۔ مسلم یونیورسٹی کا قیام اسی طرح کے مسلمانوں کے نیک ارادوں کا مظہر ہے

اور ہندوستان میں پچھلے دنوں قومی بنیاد پر جو تحریک اٹھی تھی اور جو بالآخر ہندوستان کی تقسیم اور قیام پاکستان پر منتہی ہوئی اور اسی طرز فکر کا براہ راست نتیجہ تھی۔

یہ تو عام مسلمانوں کا حال ہوا لیکن اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ شروع شروع میں تو علماء دین نے اس تہذیب پر کافی ناک بھوں چڑھائی اور اس کو روکنے کے لیے کوششیں بھی کیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ انگریزوں کا اقتدار روز بروز مستحکم ہی ہوتا چلا جا رہا ہے اور ان کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کا رُخ اسی اقتدار کی طرف ہے جس کے زیر سایہ یہ مادی تہذیب پھل پھول رہی تھی تو ان میں سے بہتوں نے تو ہوا کے رخ پر چلنا شروع کر دیا۔ اور وہ خود اس اقتدار کے دعاگو بن گئے اور اپنے لختہائے جگر کو اسی تہذیب کے آغوش میں پلنے کے لیے راضی خوشی حوالہ کر دیا، اور کچھ نے مایوس ہو کر گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا اور کچھ اگر مخالفت پر قائم بھی رہے تو یا تو ان کی مخالفت تمام تر انگریزوں کے اخراج کی سعی پر مرکوز رہی اور ان کی لائی ہوئی تہذیب کو روکنے کے لیے جو اب خود اپنے بل بوتے پر پھیلتی جا رہی تھی، کوئی ٹھوس تدبیر اختیار نہیں کی بلکہ ایک حد تک خود اس کے ساتھ سازگاری کرنے لگے یہاں تک کہ انگریزوں اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں سے بچنے کے لیے سیاسی طریقے بھی وہی اختیار کیے گئے جو اسی تہذیب کے آوردہ تھے —— یا کچھ لوگوں نے حالات کی ناموافقت سے دل شکستہ ہو کر صرف اس بات پر اکتفا کر لیا کہ وہ مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعہ کسی طرح اپنے کو اور اپنے زیر اثر مسلمانوں کو اس تہذیب و تمدن اور اس کے زہریلے اثرات سے بچائے جائیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ تدبیر کسی نہ کسی درجے میں کامیاب ضرور

ہوئی لیکن چونکہ یہ مدافعت طور پر اختیار کی گئی تھی اور اس کے ساتھ اس تہذیب کے اصل سرچشمہ کو بند کرنے کے لیے کوئی حقیقی موثر تدبیر عمل میں نہیں لائی گئی تھی اس لیے مرور ایام کے ساتھ قوتِ مدافعت بھی کمزور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اس تہذیب کے اثرات ان محفوظ گوشوں تک میں جا پہونچے جہاں دین ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے حفاظت کے ساتھ ٹھہرایا گیا تھا اور اس کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک پہونچی کہ خود ان حلقوں میں دین کی تفریق و تجزیہ کے رجحانات نشو ونما پانے لگے اور جو کارخانے اس کے لیے قائم کیے گئے تھے کہ وہاں سے دین کے علمبردار اور مبلّغ اسلام تیار ہو کر نکلیں گے، وہاں سے اس طرح کے لوگوں کی بجائے ایسے لوگ ڈھل کر نکلنے لگے جس کے جذبات پر اسلام کی بجائے قومیت و وطنیت کا رنگ غالب تھا اور اس طرح جن لوگوں کا طرزِ عمل دین کا صحیح نمونہ بن سکتا تھا خود ان کا نمونہ عام مسلمانوں کے لیے اس بات کی حجت بن گیا کہ دین و دنیا کی تفریق جائز ہے بلکہ بہت سے حالات میں ضروری بھی ہے۔

تقسیم سے پہلے

غرض ہندوستان میں انگریزی اقتدار و تہذیب کے قائم ہوتے کے بعد مسلمانوں کا عام رُخ اس کی خوشہ چینیوں ہی کی طرف منتقل ہو گیا یہاں تک کہ جو اس کے مخالف تھے وہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی طرف جھک پڑے، اس دور کی اس خصوصیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے جو علماء گوشہ گیر نہیں ہوئے تھے بلکہ تگ و دو کے میدان میں سرگرم کار تھے ان کا عام رجحان دین سے زیادہ سیاست کی طرف بڑھ گیا۔ اور سیاست بھی وہ جس کو کوشش کر کے دین سے علیحدہ رکھا گیا تھا حتیٰ کہ اس دور میں اگر دین کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی کام بھی کیا جا رہا تھا تو اس کے پس پشت سب سے بڑا مقصد یا تو یہ ہوتا

تھا کہ مسلمانوں کی عددی اکثریت بڑھائی جائے یا یہ کہ مسلمانوں کو باطل سیاست میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جائے۔ جس دور میں دین کے ساتھ یہ معاملہ روا رکھا جا رہا تھا اس میں اس بات کی کہاں گنجائش نکل سکتی تھی کہ مسلمان اپنے دنیاوی مسائل کو خالص دین کی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کرتے، چنانچہ اسی بنا پر اس دور میں ہمارے مسلم زعماء کا عام طرزِ عمل صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت و اقتدار کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لیے جو نئے مسائل پیدا ہو گئے تھے ان کو وہ انگریزوں ہی کے فراہم کیے ہوئے نسخہ کے مطابق حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں دو الگ الگ جماعتیں قائم تھیں جن میں سے ایک قومیت کے سہارے پر چل رہی تھی اور دوسری نے وطنیت کی تحریک کو اس توقع پر اپنایا تھا کہ جب یہ اپنے مقصد یعنی انگریزوں کے اخراج پر منتہی ہو گی تو اس سے خود بخود ہمارے پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں گے لیکن اس اختلاف کے باوجود ان دونوں کا مطمحِ نظر قریب قریب ایک ہی تھا، یہ دونوں اس بات پر متفق تھیں کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل صرف یہی ہے کہ ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قائم ہو۔ ایک فریق اپنے نظریہ کے مطابق اس کے لیے بلا قید و شرط ساعی تھا اور دوسرا اس شرط کے ساتھ اس پر آمادہ تھا کہ پہلے مسلمانوں کے لیے کچھ تحفظات کا بندوبست کر دیا جائے چنانچہ اسی فریق کے مطالبہ و اصرار سے اس دور میں یہاں کی وطنی جماعتوں کے ساتھ ان کے کچھ سمجھوتے اور معاہدے وغیرہ بھی ہوتے رہے جن سے اس دور کے حالات سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح واقف ہیں۔ بہر حال ایک طویل عرصہ تک دونوں فریق اپنے اپنے طور پر اسی کے لیے کوشاں رہے لیکن جب ۱۹۳۵ھ کے

آئین کے نفاذ کے بعد جمہوری طرزِ حکومت کا تھوڑا سا تجربہ سامنے آیا تو ایک فریق نے تو اس تجربہ کی ناخوشگواری کو فوراً محسوس کر لیا اور اس نے اپنی عافیت اسی میں جانی کہ وہ اس کے مزید تجربہ پر اپنا وقت ضائع نہ کرے لیکن اب بھی اس نے وہ صحیح راہِ عمل اختیار نہیں کی جس کا دین متقاضی تھا بلکہ اس کی بجائے اس نے اپنا زور قوم پرستی کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ ابھارنے پر صرف کیا اور انہی کے تحت اس نے تقسیم ہند کی تحریک شروع کر دی جس میں تھوڑے دنوں کے بعد اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔

لیکن دوسرا فریق جمہوریت کے اس ناقص تجربہ سے بددل اور مایوس نہیں ہوا کہ بلکہ اس نے بخیال خویش یہ سمجھا کہ ناقص جمہوریت کا یہ پہلا تجربہ ہے اور تجربہ بھی ایسا کہ انگریز شرارت پھیلانے کے لیے ابھی بدستور موجود ہے اس لیے اس کے نتائج کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں صبر سے کام لیا جائے، جب جمہوریت اپنی کامل شکل میں نافذ ہو گی تو اس وقت اس سے اس کے صحیح متوقع نتائج برآمد ہوں گے اور وہ اللہ کے فضل سے اچھے ہی ہوں گے۔ چنانچہ یہ گروہ بدستور اپنی راہ پر گامزن رہا بلکہ پیچھے ہٹنے والوں کی "بزدلی" کو چھپانے یا اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔

تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی عام سرگرمیاں کچھ اسی طرح کی تھیں، ان پر یا تو قومیت کا رنگ غالب تھا یا وطنیت کا۔ رہی یہ بات کہ وہ اپنے دینی فرائض کو ٹھیک طور سے محسوس کرتے اور دین ہی کے مطابق اپنے دنیاوی مسائل کو

بھی حل کرنے کی کوشش کرتے تو بلا شبہ ان میں ایسے افراد بھی رہے ہیں جو اس طرزِ فکر کے حامل اور اسی کے لیے عملاً کوشاں رہے ہیں لیکن جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اس دینی طرزِ فکر سے ہمنوائی کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ عام طور سے ان کا حال یہ تھا کہ اگر کچھ لوگوں نے اس طرزِ فکر کی دعوت بھی دینی چاہی تو ان کے لیڈروں نے اس کو بے وقت کی شہنائی سے تعبیر کیا اور اس کے لیے حالات کی ناسازگاری کو عذر بنا کر اپنے کان اس کی طرف سے بند کر لیے جس کا نتیجہ بھی بہت جلد مسلمانوں کے سامنے آ گیا۔ ان دونوں جماعتوں کی مساعی بار آور ہو گئیں، پاکستان بھی قائم ہو گیا اور ہندوستان کو بھی آزادی نصیب ہوئی لیکن جہاں تک مسلمانوں کی قسمت کا تعلق ہے وہ صرف ناکامی سے آشنا ہوئی۔ ہندوستان میں چار کروڑ مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی تفصیل و توضیح کا محتاج نہیں ہے۔ رہا پاکستان کا معاملہ تو کامیابی و ناکامی کے دینی تصور کے لحاظ سے تنہا پاکستان کا قیام کوئی خوش آیند بات نہیں جب تک واقعی وہاں اسلامی نظامِ حکومت قائم نہ ہو لیکن اس سے قطع نظر خالص بنیادی نقطہ نظر سے بھی ہم قیامِ پاکستان کو کامیابی کا ہم معنی قرار نہیں دے سکتے کیونکہ جن خطرات و مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا، خود اہلِ پاکستان کے بقول ان کے جسم کا نصف کے قریب حصہ پوری طرح انہی خطرات کے منہ میں ہے اور بقیہ حصہ بھی اب تک اپنے کو انہی خطرات میں محصور پا رہا ہے جیسا کہ خود ان کے اعلانات و بیانات سے ظاہر ہے۔ اگر یہی کامیابی ہے آخر ناکامی کس چیز کا نام ہے؟

تقسیم کے بعد

اب آئیے دیکھیں تقسیم کے بعد ہمارا کیا حال ہے۔ کیا

واقعی ہم نے ان انقلابات سے جواب تک پیش آچکے ہیں کوئی سبق سیکھا ہے اور اس کے مطابق ہمارے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا جو طرزِ عمل ہے وہ اس طرزِ عمل سے کچھ مختلف نہیں ہے جو ۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں نے اختیار کیا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ بدتر ہے۔

انگریزوں کی آمد کے وقت مسلمان خواہ کیسی ہی عملی خرابیوں میں کیوں نہ مبتلا رہے ہوں لیکن اس وقت ان کے دلوں میں دین کی محبت اور اس کی عظمت کا احساس کافی حد تک باقی تھا اور قومی غیرت و خودداری بھی ان میں بہت کچھ موجود تھی۔ اس لیے اگر وہ انگریزی تہذیب و تمدن کی طرف بڑھے بھی تھے تو بہت کچھ جھجکتے ہوئے، اور ساتھ ہی وہ چلتے چلتے بار بار مڑ مڑ کر اپنی ان دینی اور قومی روایات اور یادگاروں پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ حسرت کے ساتھ ڈال لیا کرتے تھے جن کو وہ پیچھے چھوڑے جا رہے تھے، اسی لیے ان کے قدموں کی رفتار خود بخود دھیمی پڑ جایا کرتی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان میں جو لوگ زمانہ سازی میں بہت پیش پیش تھے ان کو بھی اس روش کے اختیار کرنے کی علانیہ جرأت نہیں ہوا کرتی تھی اور دنیا داری کرنے کے لیے بھی اس بات پر مجبور رہتے کہ پہلے اس پر دینداری کا خول چڑھائیں اور اس کے بعد اسے اختیار کریں۔

لیکن اب صورتِ حال اس سے اور بھی ابتر ہے۔ انگریزوں کے طویل دورِ غلامی میں قومی خصوصیات بہت کچھ مٹ گئیں یا مضمحل ہو گئیں اور اسی طرح دینی غیرت و حمیت کو بھی اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں پیہم صدمات پہونچتے رہے اس لیے

وہ بھی مردہ و بے روح ہو کر رہ گئی نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان بے روک ٹوک پہلے سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ زمانہ سازی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں پھر اسی کے ساتھ خود ہماری غلطیوں کی وجہ سے حالات بھی بہت مجبور کن ہو گئے ہیں جن میں ناسازی سے اپنے کو محفوظ رکھنا واقعی بڑا ہی دشوار کام ہے۔

تقسیم سے چند لمحے پہلے تک مسلمان پھولے نہیں سماتے تھے کہ اللہ نے ان کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ جو لوگ آزادی کے دل دادہ تھے وہ اس بات پر خوش تھے کہ انگریز جو ان کے بقول مسلمانوں کی ہر طرح کی خرابیوں کا تنہا ذمہ دار تھا اپنی نحوستوں کے ساتھ اس ملک سے رخصت ہو رہا ہے اور جو لوگ اپنے ہر دکھ کا علاج محض سمجھتے تھے کہ ان کو کوئی قومی وطن نصیب ہو جائے، وہ اس بات پر مسرور ہو رہے تھے کہ کچھ زیادہ محنت و مشقت کے بغیر محض فضلِ رب سے انھیں ایک جنتِ ارضی حاصل ہو گئی ہے جہاں پہونچ کر وہ جیتے جی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مزا لوٹیں گے یا اگر بخت کی نارسائی کی وجہ سے وہاں نہیں پہونچ سکیں گے تو کم از کم اس کی عطر بیز اور روح پرور ہوائیں ہی ان کے غم کدوں میں ان کی فرحت و مسرت کا سامان بہم پہونچاتی رہیں گی۔ اس وقت ان میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی یہ مسرتیں کتنی عارضی ہیں اور مستقبل کے پردے میں ان کے لیے کتنی بھیانک الم ناکیاں چھپی ہوئی ہیں لیکن عین اس وقت جب فضا فرحت و مسرت کے قہقہوں سے گونج رہی تھی بلکہ مسرت پوری طرح اپنے شباب پر بھی نہیں پہونچنے پائی تھی کہ فضا آہ و بکا کے شور سے معمور ہو گئی اور اب جو مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو یہ ان کی ہی آہ و بکا کا شور تھا جو ہر چہار طرف سے بلند ہو رہا تھا۔ یہ رنگ میں بھنگ کا پہلا تجربہ تھا جو ان کو

پیش آیا اور جس نے ان کو پریشانی اور حیرانی کے ایک وسیع سمندر میں غوطہ کھاتے ہوئے چھوڑ دیا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا۔ یہ جو کچھ پیش آیا بہر حال وہ جنون کی عارضی حالت تھی جو ہند و پاکستان دونوں پر بیک وقت طاری ہوئی تھی اور دونوں جگہ اس نے کم و بیش ایک ہی طرح کا اثر دکھلایا تھا۔ لیکن اس حالتِ جنون کے فرد ہونے پر بھی جو حالات ان کے سامنے آئے وہ ان کے لیے انتہائی قلق افزا اور مایوس کن تھے، ہر چند یہ حالات، واقعات کا ایک قدرتی ردِ عمل یا نتیجہ ہی تھے لیکن چونکہ عام مسلمان اب تک انتہائی خوش گمانیوں میں مبتلا تھے اور واقعات کے قدرتی نتائج کی طرف سے انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اس لیے یہ ان کے لیے غیر متوقع بھی تھے اور غیر متوقع ہونے کی وجہ سے انتہائی اضطراب انگیز بھی۔ جو لوگ پاکستان کے داعی اور علم بردار تھے انھوں نے اپنے جوش و خروش کے زمانہ میں کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی کہ پاکستان کس کے لیے ہو گا اور ہندوستان میں رہ کر اس کے قیام سے انھیں کیا فائدہ پہنچے گا لیکن اب جب ان کی آنکھیں کھلیں تو انھوں نے دیکھا کہ پاکستان جن کو ملنا تھا مل گیا لیکن ان کی قسمت میں اُسی سرزمین میں رہنا لکھا ہے جس میں رہنے کے تصور اور اس کے منطقی تقاضوں سے وہ بالکل خالی الذہن تھے اور انہی لوگوں کے ساتھ رہنا ہے جن سے کل تک ان کی لڑائی تھی، اور جو اب ان کے حاکم ہیں اور قدرتی طور پر تقسیم اور تقسیم کرانے والوں سے خفا اور برہم ہیں۔ یہ منظر ان کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور بھیانک تھا۔ چنانچہ وہ اس کی تاب نہ لاکر یا تو بدحواسی کے ساتھ پاکستان کی طرف بھاگنے لگے یا اگر مصلحتیں اور مجبوریاں ان کی زنجیر پا بن گئیں تو وہ عاجزی اور بے کسی کے ساتھ انہی لوگوں کی دہائی دینے میں مصروف ہو گئے جن سے

کل تک وہ خود مصروف پیکار تھے ان دو راستوں کے سوا ان کو کوئی اور راستہ ہی سجھائی نہیں دیا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ جس راستہ پر چل رہے تھے اس کا انجام اس کے سوا کچھ اور رہو ہی نہیں سکتا تھا۔

یہ تو اس فریق کا حال ہوا جو قیام پاکستان سے اپنی تمام امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھا لیکن دوسرا فریق جو اب تک سب کچھ ہندوستان ہی کے لیے کرتا رہا تھا یہاں تک کہ اس نے اس کے مقابلہ میں دین اور اس کے صریح تقاضوں کی بھی بسا اوقات کوئی پرواہ نہیں کی تھی، اس کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوا۔ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی یہاں جنون کی جو آندھیاں چلیں وہ اس کا کوئی امتیاز نہیں کر سکیں کہ ان کی لپیٹ میں کون آرہا ہے۔ مسلمان خواہ لیگی رہے ہوں یا قوم پرور سب کو کم و بیش ایک ہی انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ اور جب یہ طوفان اپنی حد کو پہونچ کر ختم ہوا تو اس وقت بھی اس فریق نے پایا تو یہ پایا کہ ان کے دوستوں کی نگاہیں خود ان سے بھی پھری ہوئی ہیں اور ان کی سابقہ قربانیوں یا وفاداریوں کا اگر کچھ صلہ ہے تو صرف یہ کہ ان کے شکوہ و شکایت پر نگاہیں کچھ شرم سے نیچی کر لی جائیں اور بس۔ یہ منظر اس فریق کے لیے انتہائی یاس و حزن کا موجب ثابت ہوا اس لیے ان کے لیے بھی چارہ کار عمومی طور سے یا تو یہ تھا کہ وہ مایوس ہو کر گھروں میں بیٹھ رہیں — کیونکہ ان میں سے کتنوں کی غیرت اسے گوارا نہیں کرتی کہ جس پاکستان کے قیام کی انھوں نے مخالفت کی تھی وہ اسی کو اپنی جائے پناہ بنائیں۔ یا پھر یہ کہ سب کچھ بھلا کر پہلے گروہ کی طرح اپنے کو جدید حالات اور ان کے تقاضوں کے لیے تیار کریں۔

مسلمانوں کی اکثریت انہی دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کا عام طرزِ عمل کچھ اسی قسم کا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ ان کے حوصلے پست ہو گئے ہیں، مایوسی ان کے دلوں پر چھا گئی ہے اور ان کا کام بس یہ رہ گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو یہاں کی اکثریت کو خوش کیا جائے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے ان کے لباس، معاشرت، نام اور طرزِ کلام وغیرہ میں تبدیلیاں واقع ہوتی جا رہی ہیں اور ظاہر کے ساتھ ان کا باطن بھی تیزی کے ساتھ بدلتا جا رہا ہے۔ بڑے بڑے سورما جو قوم پرستی پر ایمان رکھتے تھے آج ان میں اتنی بھی جرأت نہیں ہے کہ وہ قومیت کا بھی جو ایک جائز چیز ہے نام لے سکیں۔ بڑے بڑے مجاہد جنھوں نے برطانیہ عظمیٰ کی شہنشاہیت کو چیلنج کیا تھا اب اپنے کو اس کے لیے مجبور پا رہے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی ہو اس پر اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہیں یا خاموش ہو جائیں۔ ہم میں نئے نئے مفسر پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک تمام ادیان یکساں طور سے حق ہیں، اس لیے یہ حماقت کا کام ہے کہ مسلمان کسی متعین دین یا اس کی امتیازی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے فکر مند ہوں۔ ہم میں نئے نئے مورخ پیدا ہو رہے ہیں جن کی تحقیق یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کوئی مخصوص چیز ہے ہی نہیں، ہندوستان میں جو تہذیب رائج ہے یہی بعینہ اسلامی تہذیب ہے۔ ہم میں نئے نئے شارحِ دین پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک دین و سیاست الگ الگ چیزیں ہیں اور مسلمانوں کا کام محض اتنا ہے کہ وہ مسجدوں میں جا کر نماز ادا کر لیا کریں یا شادی بیاہ کے کچھ مخصوص طریقے جن کو دینی کہا جاتا ہے اختیار کر لیا کریں اور اپنے بقیہ کام جس دنیاوی طریقے سے چاہیں انجام دیں۔ ہم میں نئے نئے محقق پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک لادینی ہی اصل دین ہے اس لیے وہ یا تو لادینی جمہوریت کے داعی و مبلغ ہیں یا سوشلزم اور کمیونزم کے، غرض نئے نئے فتنے برپا

ہو رہے ہیں اور مسلمان تیزی کے ساتھ ان میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ جن لوگوں پر اصلاحِ حال کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے، وہ یا تو یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور خاموش ہیں یا پھر وہ خود اپنے طرزِ فکر و عمل سے ان فتنوں کی تقویت کا باعث بنتے جا رہے ہیں اور ان میں سے کتنوں کا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ اگر کسی گوشے سے اس صورتِ حال کے خلاف کوئی بے چینی ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ اپنی پوری کوشش اس کے فرو کرنے میں صرف کر دیتے ہیں اور یہ سب کچھ مذہب اور مصلحت کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ ع حیف گر از پسِ امروز بود فردائے۔

مسلمانوں کی یہ حالت کوئی مخفی چیز نہیں ہے، یہ کم و بیش ہر شخص کی جس میں ہم بھی داخل ہیں، اپنی ہی داستان ہے اس لیے اس کی زیادہ تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ ہماری یہ حالتِ زبوں اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ اس پر غیروں کو بھی ترس آنے لگا ہے ذیل کے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

مسٹر جے پرکاش نرائن نے مسلم قوم کی حالت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

"مسلم آبادی اتنی زیادہ بزدل اور بے ہمت ہو گئی ہے کہ اپنے معتقدات کے مطابق عمل کرنے کی جرأت نہیں کرتی، ان کو یہ خوف ہے کہ اگر وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کریں گے تو ان کی وفاداری مشکوک ہو جائے گی"

ماسٹر تارا سنگھ نے جیل سے رہائی کے بعد حسبِ ذیل الفاظ میں جیل کے مسلمان قیدیوں اور ملازموں کا حال بیان کیا تھا:۔

"میں الموڑہ جیل میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سب مسلمان قیدی اور مسلمان سپرنٹنڈنٹ جیل میں "رگھوپتی رگھو راجا رام" کا گیت گاتے تھے اور ان

میں کوئی بھی نماز نہیں پڑھتا تھا، میں نے ان سے سوال کیا آپ اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں لیکن ان کا حوصلہ اس قدر گر چکا تھا کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے "

اور یہ واضح رہے کہ یہ بیانات آج سے کچھ زمانہ پہلے کے ہیں جب کہ مسلمانوں کا حالِ زبوں دیکھ کر بہت سے دیکھنے والوں کو حیرت بھی ہوتی تھی اور ترس بھی آتا تھا لیکن چونکہ اب یہ ایک روزمرہ کی بات ہوگئی ہے اور نگاہیں اس کے دیکھنے کی عادی بن چکی ہیں اس لیے اب اس طرح کے بیانات بھی شاذونادر ہی کہیں دیکھنے میں آسکتے ہیں البتہ مسلمانوں کی حالت کا مذکورہ نقشہ کچھ پہلے سے زیادہ وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ ہے مسلمانوں کے گذشتہ مختلف ادوار کا مختصر خاکہ۔ اس کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو مسلمانوں کی اس روش پر جو وہ اس وقت الیکشن کے سلسلہ میں اختیار کیے ہوئے ہیں مطلق حیرت نہ ہوگی۔ جب کوئی قوم اپنے بنیادی معتقدات و تصوّرات اور اپنی ملی خصوصیات کو چھوڑ دیتی ہے تو یا تو اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے یا اگر وہ باقی رہتی ہے تو انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ اور ذلت و خواری کا یہ خاصہ ہے کہ افراد اور اقوام اس میں مبتلا ہو کر یا تو اضمحلال و پژمردگی کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان میں حالات کے مقابلہ کی ہمت و جرأت باقی نہیں رہ جاتی یا اگر وہ کچھ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو اس طور سے کہ وہ اپنی قومی روایات و خصوصیات کے ساتھ اپنی غیرت و حمیت کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی خوشامدیں کر کے اپنی زیست کا یا کچھ زیادہ حوصلہ ہوتا ہے تو اپنی انفرادی دنیاوی عزت و سربلندی کا سامان کر لیتے ہیں یا بہت

زیادہ حوصلہ سے کام لیتے ہیں تو اپنی قومی تنظیم کے ذریعہ اپنی منتشر قوتوں کو حالات کے مقابلہ کے لیے جمع کرنے کی فکر کرتے ہیں خواہ اس کا نتیجہ ان کے معتقدات و تصورات اور ان کے ملّی وجود کے حق میں اچھا ہو یا برا۔ چنانچہ یہی سب کچھ ہندوستان میں رونما ہو رہا ہے، زیادہ تر مسلمان پژمردگی میں مبتلا ہو کر ہاتھ پاؤں چھوڑ چکے ہیں اور جو لوگ کچھ متحرک ہیں ان کے سامنے دو ہی راہیں ہیں یا تو وہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ ایسا کرنا دینی نقطۂ نظر سے یا مسلمانوں کے عمومی فائدہ و نقصان کے پہلو سے صحیح ہوگا یا غلط۔ یا پھر قومی بنیادوں پر اپنی تنظیم کی فکر کر رہے ہیں، رہی وہ روشن راہ جسے اختیار کر کے وہ اپنی موجودہ بدبختیوں کو دور کر سکتے ہیں اور جس کا اختیار کرنا ان کا اصلی اور حقیقی فریضہ بھی ہے تو اس کی نہ ان کو کوئی فکر ہے اور نہ ہمّت۔

اسلام اور مسائل حیات

ہمارے نزدیک جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ دین کو اپنے جملہ معاملات کا رہنما قرار دیں۔ اسلام (جس کے وہ ماننے کے مدعی ہیں) دنیا میں آیا ہی اس دعوی کے ساتھ ہے کہ وہ انسانی مسائل کا آخری حل ہے اور اس کے ماسوا انسان نے اپنے مسائل کے حل کے لیے خود جتنے طریقے بھی سوچے ہیں وہ سب فوز و کامیابی کی بجائے ہلاکت و خسران کا ذریعہ ہیں۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ بھی یہ بتلاتی ہے کہ ان کا اقبال و ادبار ہمیشہ دین سے ان کے عملی تعلق یا عدم تعلق سے وابستہ رہا ہے۔

لیکن بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان نہ صرف عملاً دین سے غافل ہو گئے ہیں بلکہ ان میں کثرت سے ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں جن کا دین کا تصور ہی بہت ناقص و محدود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دین محض چند مخصوص قسم کی عبادات اور رسم و رواج کا نام ہے اور اس کا کوئی تعلق انسان کے عمومی مسائل سے نہیں ہے، ایسا سمجھنے والے کچھ تو جاہل عوام ہیں جن کو اول تو بتایا ہی یہ گیا ہے کہ رسم و رواج کے تحت جو کچھ وہ کرتے ہیں دین اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور

دوسرے وہ جن لوگوں کی طرف عقیدت کی نظریں اٹھاتے ہیں، بدقسمتی سے ان کا عملی نمونہ بھی انھیں دین و دنیا کی تفریق ہی کا سبق پڑھاتا ہے اس لیے یہ بے چارے دین کے بارے میں یہ تصوّر رکھنے پر مجبور ہیں اور کچھ جدید تعلیم یافتہ ہیں جنھوں نے اپنا تمام تر وقت مغربی علوم و فنون کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور اسلام کے بارے میں ان کی معلومات محض سنی سنائی باتوں تک محدود ہے اس لیے ان کا تصوّر، دین کے بارے میں اہل مغرب کے تصوّر سے کچھ مختلف نہیں ہے یعنی یہ کہ مذہب انسان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک شعبہ ہے حالانکہ اسلام کی تعلیمات کو سرسری طور سے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے متعلق یہ تصوّر کتنا غلط ہے - اس وقت کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے لیکن اس تصوّر کی غلطی کسی لمبی چوڑی بحث کی بجاے صرف اتنی بات سے اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے کہ جس کلمہ کا اقرار کر کے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے، مجرد وہ کلمہ اس کی زندگی کو اجتماعی مسائل سے مربوط کر دیتا ہے بشرطیکہ اس نے شعور کے ساتھ اس کا اقرار کیا ہو۔ اس کلمہ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو ماننے والا اللہ تعالیٰ کو اپنا حقیقی معبود اور فرمانروا تسلیم کرتا ہے، پس جب ایک شخص اس کلمہ کو ایک بار صدق دل سے تسلیم کر لے تو اس سے خود بخود چند اصولی باتیں متعین ہو جاتی ہیں مثلاً اب اس کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ۔

(۱) اپنے کو حاکمِ مطلق سمجھے اور خدا کے احکام سے بے نیاز ہو کر حکومت و فرمانروائی کرے اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ اپنے عقیدہ کی

علی الاعلان تردید کرتا ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ — کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

اس آیت سے یہ صاف واضح ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ایک طرف وہ خدا کی خدائی کا بھی اعتراف کرے اور دوسری طرف وہ اس کے احکام و ہدایات کی پیروی کی بجائے اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرے ایسا شخص خدا کا نہیں بلکہ اپنے نفس کا پجاری ہے اور اسے ہرگز یہ دعوٰی کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ خدا کو تسلیم کرتا ہے، چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

والذی نفسی بیدہ لا یکون احدکم مومنا حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ — قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس دین و شریعت کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لایا ہوں

(۲) وہ خدا کے سوا کسی فرد یا مجموعۂ افراد کے لیے، خواہ وہ علماء و فضلاء ہوں یا جمہور و عوام الناس، یہ حق تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ خدا کی کسی سند کے بغیر محض اپنی عقل کی روشنی میں یا رایوں کی کثرت کی بنیاد پر کوئی قانون بنائیں اور اسے نافذ کریں ایسا کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ خدا کی جو حیثیت اس نے تسلیم کی ہے اسے وہ دوسروں کو دے رہا ہے چنانچہ اسی بنا پر اہل کتاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ — انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور

اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۔ اپنے راہبوں کو رب بنا لیا ہے۔

اور جن کی تشریح حدیثوں میں یہی کی گئی ہے کہ یہ لوگ اپنے علماء و فقہاء کی باتیں بغیر کسی سندِ الٰہی کے مان لیا کرتے تھے اور یہی ان کو رب بنانا ہے جو خالص خدا پرستی کے منافی چیز ہے۔

غرض یہ مختصر کلمہ اپنے اندر بہت سی اصولی ہدایات رکھتا ہے جن کا موجودہ مسائل اجتماعی سے بہت گہرا ربط ہے اس لیے آپ خود غور کریں کہ یہ کہنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اور اس کا عمومی و اجتماعی مسائل و امور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ تو تفریقِ دین و دنیا کے بارے میں دینی نقطۂ نظر کا حال ہے اور اگر عقل کی روشنی میں غور کریں تو اس سے بھی اس تصوّر کی غلطی واضح ہو سکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر مہمل بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور پرائیویٹ معاملات میں تو خدا کی ہدایت و رہنمائی کی ضرورت محسوس کریں لیکن اجتماعی زندگی کے وہ معاملات جو ان سے کہیں زیادہ وسیع مشکل اور پیچیدہ ہیں ان میں ہم اس کی ہدایت و رہنمائی سے اپنے کو بے نیاز اور مستغنی سمجھ لیں؟ یا اللہ تعالیٰ چھوٹے چھوٹے مسائل میں تو ہماری رہنمائی فرمائے لیکن اس کا جود و کرم عین مشکل میں ہمارا ساتھ چھوڑ دے؟ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ یا تو خدا کے وجود اور اس کی ضرورت کا سرے سے انکار کر دینا چاہیے، ایسا خدا کس کام کا ہو سکتا ہے جس سے ہماری اصلی ضرورت ہی پوری نہ ہو سکے؟ اور اگر اس کی کچھ ضرورت ہے تو پھر اس کو اس حیثیت سے تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ

ہر آن ہمارا خدا ہے اور ہم اپنے جملہ معاملات میں اس کی ہدایت و رہنمائی کے محتاج ہیں۔

اور یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جہاں ایک بار آپ نے خدا کو اس کے وسیع تر دائرہ حدود سے خارج کیا، آپ کے لیے کسی تنگ تر دائرہ میں بھی، اس کے ساتھ رشتہ قائم کرنا کوئی آسان بات نہ ہوگی۔ اول تو نجی اور غیر نجی زندگی کی تقسیم ایک مفروضہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، انسان اگر کسی جنگل میں تنہا زندگی گذارنا چاہے تو ممکن ہے اس کی زندگی اس تقسیم کی پابند ہو سکے، لیکن اگر وہ انسانوں کی طرح انسانوں کے ساتھ رہتا ہے، تو اس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہو سکتا جس کا تعلق کسی دوسرے انسان سے نہ ہو یا اس سے کسی دوسرے پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو۔ یہاں تک کہ وہ کوئی ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا جس میں کہیں نہ کہیں کوئی دوسرا انسانی وجود اس کے فکر و خیال سے متاثر نہ ہو رہا ہو۔ پس خدا کو نجی زندگی تک محدود کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ حقیقتاً اس کو اپنی زندگی سے خارج کر رہے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی درجہ میں یہ تقسیم ممکن بھی ہو تو انسان کے جن معاملات کو پرائیویٹ یا مذہبی کہا جاتا ہے وہ اس کے دوسرے عمومی اجتماعی مسائل سے، جن کو دائرۂ مذہب سے خارج کر دیا گیا ہے، اس طرح پیوست اور مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے غیر متعلق کر دینا قطعاً ناممکن ہے۔ اس لیے اجتماعی معاملات کو خدائی احکام و ہدایات سے الگ کر دینے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنی انفرادی یا عرفِ عام کی مذہبی زندگی میں بھی زیادہ

دنوں تک مذہبی باقی رہ سکے۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تفریقِ دین و سیاست کی پالیسی جہاں جہاں بھی کارفرما ہے وہاں روز بروز مذہب زوال پذیر ہے اور یہ پہلو اُن لوگوں کے لیے خاص طور سے قابلِ توجہ ہے جو لادینیت (سیکولرزم) کو رحمتِ خداوندی سمجھتے ہیں یا تفریقِ مذہب و سیاست پر اس حیثیت سے مطمئن ہیں کہ اس طرح مذہب سیاست کی دست درازیوں سے محفوظ رہ کر خوب پھلے پھولے گا۔ بہرحال یہ تفریقِ دین و دنیا کا تصوّر ہر لحاظ سے ایک نہایت غلط اور مہمل تصوّر ہے اس لیے مسلمانوں کو صاف صاف فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ کُلّی طور سے احکامِ دین کی پیروی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ یعنی وہ اپنے انفرادی معاملات کے ساتھ اپنے اجتماعی معاملات کو بھی دین کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر اس پر ان کا دل راضی نہیں ہے تو ان کے لیے کوئی مجبوری نہیں ہے وہ شوق سے اپنے لیے بے دینی کا جو راستہ بھی پسند کریں اختیار کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ دین کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو پھر ان کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت انھوں نے اپنے عمومی مسائل اور بالخصوص الیکشن کے ضمن میں جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ کہاں تک دین کے مطابق ہے اور ان مسائل کے بارے میں دین کی صحیح رہنمائی کیا ہے اور اس کے بعد جہاں تک ممکن ہو اسی دینی روش کو اختیار کرنے اور اس پر چلنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اس کے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنا ایک فضول سی بات ہے جس کی توقع کم از کم ان لوگوں سے نہیں کی جا سکتی جو مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اسلام ہی پر مرنا چاہتے ہیں خواہ وہ نادان

طور پر اس وقت کسی معاملہ میں غیر اسلامی روش ہی پر کیوں نہ چل رہے ہوں۔

موجودہ الیکشن اور اسلام

اس اصولی گفتگو کے بعد کہ الیکشن وغیرہ جیسے مسائل دائرہ دین سے خارج نہیں ہو سکتے، اب مختصراً یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ فی الواقع اسلام نے ان مسائل کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ یہ ہدایات قرآن شریف کی اصولی تعلیمات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریحی اقوال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عملی نمونوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہیں ـــــ بلاشبہ اس دور اور اس دور کے حالات و مسائل میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے لیکن اگر یہ بات سچ ہے کہ معاملات کی نوعیت یکساں رہتی ہے اور فرق جو کچھ ہوتا ہے وہ ظاہری مظاہر و اشکال میں ہوا کرتا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس دور میں انسانوں کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس دور میں بھی ہمارے لیے ویسی ہی کار آمد ہو سکتی ہیں جیسی کہ اس وقت تھیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ مرور ایام سے ہر پچھلی بات پرانی نہیں ہو جایا کرتی ہے، انسانی زندگی کے کتنے معاملات و مسائل ہیں جو آج صدیوں کے بعد بھی ویسے ہی تر و تازہ ہیں جیسے اس وقت تھے، اس لیے ان کے بارے میں جو بات اس وقت صحیح ہو سکتی تھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ از خود اس زمانہ میں غلط ہو جائے بالخصوص وہ باتیں جو وقتی حالات کے بجائے انسانی فطرت سے براہ راست تعلق رکھتی ہوں،

ان کے خواہ مخواہ بدل جانے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ فطرتِ انسانی اب بھی ویسی ہی ہے جیسی اب سے ہزار دس سال پہلے رہی ہے اور اس کے متعلق احکام دینے والی ہستی بھی وہی ہے جو ہمیشہ تھی اور ہمیشہ رہے گی اس لیے ان احکام کے بدلنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔

چنانچہ اگر آپ قرآن و حدیث کا مطالعہ اس غرض سے کریں گے کہ ان سے آپ اپنے موجودہ معاملات و مسائل کے بارے میں ہدایت و روشنی حاصل کریں تو آپ کو ان میں ہر طرح کے معاملات کے متعلق ہدایات نمایاں طور پر ملیں گی اور اگر حقیقتاً ایسا نہ ہو تو اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ کس طرح صحیح مانا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کا آخری ضابطۂ حیات ہے جو ہر زمانہ میں ہر طرح کی ضروریات کے لیے بالکل کافی ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک طرف عرصۂ دراز سے ان ہدایات کا کوئی عملی ظہور یا نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے جس کو دیکھ کر ہم ان کو متعین و متشخص کر سکیں اور دوسری طرف ہم صدیوں سے تفریقِ دین و دنیا کے سایہ میں زندگی گذار رہے ہیں اس لیے قدرتی طور پر ان ہدایات پر ہماری نگاہیں ٹکتی ہی نہیں ہیں یا اگر ٹکتی ہیں تو ہم ان کو زبردستی توڑ مروڑ کر اپنی ذہنی ساخت اور ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ ہدایتیں ہمارے کس کام آسکتی ہیں!۔

بہر حال دین نے ہمیں الیکشن وغیرہ جیسے معاملات کے بارے بھی ہدایات دی ہیں اور انہی ہدایات پر عمل پیرا ہونا مسلمانوں کا اصلی فریضہ ہے

اوران کی ہی پیروی سے ان کے موجودہ مشکلات وآلام کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ آئیے ہم غور کریں یہ ہدایات کیا ہیں ؟

ہمارے نزدیک دینی حیثیت سے مسلمانوں کے کرنے کا جو کام ہوسکتا ہے اس کی ابتدا اس بات سے ہوتی ہے کہ آئندہ انتخاب سے مسلمانوں کو کلیتہً الگ رہنا چاہیے یہ صحیح راستہ پر چلنے کے لیے پہلا قدم ہے ۔

یہ طریقہ ہمیں کیوں اختیار کرنا چاہیے اور اس سے کیا فائدہ یا نقصان پہونچ سکتا ہے اس پر ہم آئندہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے لیکن اس سے پہلے میں یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت الیکشن سے علیحدگی کا جو مشورہ دیا جارہا ہے یہ اُس طرح کی علیحدگی نہیں ہے جس کو مسلمانوں کی اکثریت پہلے ہی سے اختیار کیے ہوے ہے اور جس کی ہم اس سے پہلے مذمت بھی کرچکے ہیں ۔ یہ دونوں علیحدگیاں بظاہر ایک سی معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے ۔

پہلی علیحدگی کسی فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ غفلت وبے پروائی یا دل شکستگی کا نتیجہ ہے ۔ حالات کے دباؤ نے مسلمانوں کو اس درجہ مایوس اور دل شکستہ کردیا ہے کہ وہ زندگی کے اہم ترین مسائل میں بھی کوئی حصہ لینے کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور نہ وہ اس کے لیے حالات ہی کو کچھ سازگار پا رہے ہیں اس لیے وہ مجبوراً انتخابات سے بھی علیحدہ رہنا چاہتے ہیں لیکن اگر حالات میں آئندہ تبدیلی واقع ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کس ذوق وشوق کے ساتھ ان میں حصہ لیتے ہیں اور اس کے برعکس ہم جس علیحدگی کا مشورہ دے رہے ہیں وہ ایک مستقل فکر ہے جس کو غفلت و

بے پروائی سے کوئی دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے اور یہ علیحدگی بے اختیاری نہیں بلکہ اختیاری ہے اور یہ ہر حیثیت سے بے تعلقی کے مترادف بھی نہیں ہے بلکہ یہ تعلق ہی کی ایک قسم ہے۔ ع ۔ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ ۔

اس لیے محض ظاہری مشابہت کی بنا پر دونوں کو ایک قرار نہیں دیا جا سکتا۔

الیکشن کے دینی نقصانات

دینی نقطہ نظر سے ہمیں الیکشن میں کیوں حصّہ لینا نہیں چاہیے اس کے وجوہ ہمارے نزدیک بہت واضح ہیں۔

سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ جب اسلام خود ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اور اس کی پیروی اور اس کی قولی و عملی تبلیغ، ایک مسلمان کا سب سے اہم اور اصلی فریضہ ہے تو یہ اس کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس فریضہ کو بالائے طاق رکھ کر الیکشن میں حصّہ لے؟ اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ ایسا کیے بغیر الیکشن میں حصہ لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

ایک مسلمان — جیسا کہ اوپر ضمناً گذر چکا ہے۔ خدا کی حاکمیت پر ایمان رکھتا ہے جو دربارتوں کے ماسوا اس کے بنیادی کلمہ کا براہِ راست اور اولین تقاضا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ الیکشن کا پورا ہنگامہ حاکمیت جمہور کا تماشہ ہے جس کا رشتہ کسی طرح کھینچ تان کر بھی حاکمیتِ خدا سے جوڑا نہیں جا سکتا ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ حکومت و فرمانروائی کے جملہ اختیارات اصلاً خدا کے لیے مخصوص مانے اور بحیثیت نائب ہونے کی حیثیت کے ان کا استعمال کسی حال میں کسی انسان کے لیے صحیح نہ سمجھے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ مجالسِ قانون ساز

کے ارکان احکام الٰہی سے مطلق بے نیاز ہو کر کامل خودمختاری کے ساتھ قانون بناتے ہیں اور پھر اپنی پوری خودمختارانہ حیثیت میں ان کا نفاذ کرتے ہیں خدا کی قانون سازی کا اعتراف اور اس کے قانون کی اطاعت تو درکنار خدا کا نام بھی کہیں درمیان میں بھولے سے نہیں آتا اور اگر اتفاق سے آجاتا ہے تو اس کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے کیا آپ کو یاد نہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں کچھ سادہ لوح ممبران نے تجویز پیش کی تھی کہ آئین میں یہ بات بھی داخل کر دی جائے کہ ارکان اسمبلی کے لیے خدا کے نام پر حلف اٹھانا ضروری ہے جو یقیناً ایک مہمل تجویز تھی کیونکہ جب سب کچھ اس سے بے نیاز ہو کر ہی کرنا ہے تو خواہ مخواہ اس کا نام لینے سے بجز اس کے اور فائدہ ہی کیا ہے کہ اس کو اپنی بغاوت پر گواہ ٹھہرایا جائے لیکن اس تجویز پر جو تقریریں کی گئیں ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ اسمبلیوں کو اللہ اور اس کے قانون سے کیا نسبت ہے بعض ممبروں نے برجستہ کہا کہ جب خدا پارلیمنٹ کا ممبر ہی نہیں ہے تو اسے ہمارے معاملات میں دخل انداز ہونے کا کیا حق ہے اور کچھ ممبران نے تو اس موقع پر ایسے کلمات بھی استعمال کیے جن کو قلم پر لاتے ہوئے ہمارا دل ڈرتا ہے۔

یہ تو ایک بنیادی بات ہوئی لیکن اس کے ساتھ اگر آپ تفصیلات میں گھس کر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ الیکشن میں آپ جس نوعیت سے بھی حصہ لیں قدم قدم پر آپ احکام و ہدایات شریعت کو پامال کر رہے ہیں۔ طریقۂ انتخاب، طریقۂ امیدواری، الیکشن کا پروپیگنڈا، وزارت، پارٹیوں کی تشکیل، بحث و مباحثہ کا عام انداز اور اس طرح کی جملہ باتیں وہ ہیں جو یورپ کے موجودہ غیر خدا پرستانہ نظامِ زندگی سے حاصل کی گئی ہیں اور ان میں سے

بیشتر چیزیں کلیتًا یا جزءً اسلامی طرزِ فکر وعمل کے بالکل خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر طریقِ امیدواری ہی کو لیجیے جو الیکشن کا سنگِ بنیاد ہے یہ چیزیں اس زمانہ میں اتنی مقبول ہوچکی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہہ کر کوئی شخص قدامت پسندی، رجعت پرستی اور پستی فکر وخیال وغیرہ کے طعنوں سے بچ نہیں سکتا لیکن جب آپ اس پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اسلام نے الیکشن کی اس بنیاد ہی کو ڈھا دینا چاہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت ہے کہ کسی ایسے عہدہ یا خدمت کی خواہش نہ کی جائے جس میں عزت وحکومت بھی ملی ہوئی ہو آپ نے فرمایا:۔

لَا تَسْاَلِ الْاِمَارَۃَ فَاِنَّکَ اِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَۃٍ اُعِنْتَ عَلَیْھَا وَاِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ مَسْئَلَۃٍ وُکِلْتَ اِلَیْھَا۔ (بخاری ومسلم)	حکومت طلب نہ کرو کیونکہ اگر وہ تمھیں بے طلب مل گئی تو اس کے سلسلہ میں تمھیں اللہ کی طرف سے مدد ملے گی لیکن اگر تم کو طلب کے بعد ملی تو تم اس کے حوالہ کر دیے جاؤ گے۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے۔

اِنَّا وَاللّٰہِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَہٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْہِ۔	خدا کی قسم ہم حکومت کے منصب پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کریں گے جو اس کا خواستگار ہو، اور نہ ایسے شخص کو جو اس کی حرص کرے۔

یہ ہدایات ظاہر ہے، ایک اسلامی نظامِ حکومت سے متعلق ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر طلب وامیدواری کسی غیر اسلامی نظامِ حکومت کے کسی اعزازی منصب کے لیے ہو تو اس کی قباحت اور کتنی بڑھ جائے گی اور اسی سے اس بات کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسے امیدواروں کی تائید وحمایت کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے کیسا ہوگا۔

اگر یہ ہدایات صحیح طور پر بروئے کار لائی جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا ہنگامۂ انتخاب خود بخود بہت کچھ سرد پڑ جائے گا کیونکہ انتخاب کا ہنگامہ زیادہ تر ایسے لوگوں کے دم قدم سے زندہ ہے جو عہدوں کے حریص اور بھوکے ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے کو پیش کرتے ہیں اور پیش ہی نہیں کرتے بلکہ اپنی کامیابی کے لیے معلوم نہیں، کیا کیا انسانیت و شرافت سے گری ہوئی حرکتیں کرتے ہیں، رہے وہ لوگ جو ان کے مقابلہ میں زیادہ اہل ہو سکتے ہیں تو وہ خود ہی اپنے کو اس ہنگامہ سے الگ رکھتے ہیں اور اگر وہ آگے بڑھنا بھی چاہیں تو ان کو پوچھتا کون ہے۔

اور یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ شریعت نے اگر کسی منصب و اعزاز کی امیدواری کو اس طرح ممنوع و مذموم قرار دیا ہے تو یہ اس کی طرف سے کوئی تشدد آمیز بات نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امیدواری طرح طرح کے فتنوں کی جڑ ہے۔ جو لوگ اس طرح کی خدمتوں کے لیے خود امیدوار بنتے ہیں وہ اپنے خلوص اور ہمدردئ خلق کا کتنا ہی ڈھنڈورا کیوں نہ پیٹیں ان میں ایسے لوگ نہایت ہی کم ہیں جن کے پیش نظر واقعی خدمت ہو، عام طور سے وہی لوگ امیدوار بنتے ہیں جو اقتدار کے بھوکے ہوتے ہیں اور اس اقتدار کو وہ تمام تر اپنی ذاتی نفع اندوزیوں ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں اس لیے اس کا دروازہ کھول دینے کے معنی یہی ہیں کہ اچھے لوگ کبھی ابھر کر سامنے نہ آسکیں اور اسمبلیوں کی کرسیوں پر خود غرضوں و نااہلوں کا قبضہ ہو جائے۔

اور یہ بات بھی یاد رکھیے کہ امیدواری کے سلسلہ میں یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں اس بات سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ امیدوار بطور خود کھڑے نہ ہوں بلکہ پارٹیوں کی طرف سے کھڑے کیے جائیں، بلاشبہ ایسے کسی امیدوار کے بارے میں نسبتاً کچھ زیادہ حسن ظن

سے کام لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ جو پارٹی اسے امیدوار بنا کر کھڑا کر رہی ہے اس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ کوئی اصولی پارٹی ہے اور وہ اگر خدا سے خوف و محبت کا تعلق نہیں رکھتی تو کم از کم اپنے اصولوں کی وفاداری میں پختہ ہے اور ان کے مقابلہ میں وہ کسی شخصیت وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں عام طور سے پارٹیوں کا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ ہمیشہ اہل تر اشخاص کو نامزد کریں گی بالکل عبث ہے۔ پارٹیاں بالعموم اسی طرح کی اغراضِ دنیّہ کے ساتھ قائم ہوتی ہیں جو خود غرض امیدواروں کے سامنے ہوتی ہیں اس لیے ان کے کھڑے کیے ہوئے امیدوار ظاہر ہے انفرادی اُمیدواروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ خطرناک تو ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ پارٹی کی پوری قوت ان کی پشت پر ہوگی — لیکن ان سے بہتر کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ اور اگر کچھ پارٹیاں ایسی ہوں جن کے مقاصد کچھ بلند ہوں اور ان میں کچھ نسبتاً بہتر لوگ بھی شریک ہوں، تو عام طور سے پارٹیوں کی تشکیل جس طرح عمل میں آتی ہے اور امیدواروں کے انتخاب میں جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس پارٹی کے اچھے لوگ ہی اُمیدوار منتخب کیے جائیں گے اور بُرے لوگ ان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے جب کہ اس وقت تک عام تجربہ بھی اس کی تردید کر رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی پارٹی عرف عام میں پارٹی کہلانے کی مستحق ہے تو اس میں کسی مخلص اور ایماندار آدمی کے رہنے کی گنجائش ہی بہت تھوڑی ہے بلکہ نہیں ہے۔ ہر ایسی پارٹی کا اولین مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ہر حال میں اپنی پارٹی کا ساتھ دے، خواہ ایسا کرنے میں اسے حق کا اور اپنے ضمیر کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور ظاہر ہے اس شرط کو پورا کرنے والے سب کچھ ہو سکتے ہیں

لیکن ایمان دار نہیں ہو سکتے اور اسی شرط کی نسبت سے اس پارٹی میں آدمی کے درجات متعین ہوتے ہیں اس لیے ایماندار لوگ اس کا رُخ بھی نہیں کر سکتے۔ ؏

جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

اور اگر کوئی کسی "مجبوری" سے شریک بھی ہو جائے تو اسے ہمیشہ پچھلی ہی صفوں میں رہنا پڑے گا الّا یہ کہ پارٹی کی کوئی مصلحت اسے آگے لے آنے کا تقاضا کرے۔

الیکشن کے دینی مضرات پر اس وقت کسی مفصل بحث کا موقع نہیں ہے یہ ایک مستقل عنوان ہے جو کسی قدر فرصت کا طالب ہے انشاء اللہ اس پر تفصیلی گفتگو اور کسی موقع پر ہوگی۔ فی الحال امیدواری کی اسی ایک مثال کو سامنے رکھتے ہوئے آپ اندازہ کریں کہ انتخاب کی وادی ایک مسلمان کے لیے کتنی پرخار ہے جس میں قدم قدم پر اس کا دامن خارِ معصیت سے الجھتا ہے۔ اگر اس حالت کے بعد بھی آپ کا شوق مجبور کر رہا ہو تو یہ آپ کی ہمت ہے، ہم اس سے روکنے کا حوصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ البتہ اتنی درخواست کرنے کو جی ضرور چاہتا ہے کہ اگر ہو سکے تو کبھی کبھی اسے ضرور یاد کر لیا کریں کہ آپ کون ہیں اور آپ دنیا میں کیا کرنے کے لیے آئے ہیں۔

تغافل کا عذر

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں لوگ دین کے صحیح تقاضوں سے بچنے کے لیے موجودہ تغافل کا جو عذر پیش کیا کرتے ہیں مختصراً اس پر بھی غور کر لیا جائے۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک عرصہ سے انتخابات ہوتے آرہے ہیں اور ان میں عام مسلمان تو درکنار بڑے بڑے علماء و فضلاء نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ہمیشہ حصہ لیا ہے اور اب بھی ان کی ایک بڑی تعداد صوبہ جاتی و مرکزی

اسمبلیوں میں شریک ہے اس لیے اس تعامل کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ الیکشن میں حصہ لینا دینی نقطۂ نظر سے کیا ہے؟ یہ تعامل اس کے جواز و استحسان کی خود ایک بڑی روشن دلیل ہے۔

یہ اعتراض زیادہ تر کم پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کے پیش کرنے والوں کی تعداد بڑی کافی ہے اس لیے ہمیں اس پہلو سے اس پر بہت زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء نے اپنے طرزِ عمل سے اس مسئلہ کے متعلق عوام کو کتنی شدید غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے اور اس لیے ہم نہایت شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اپنی حد تک اس مسئلہ کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر واضح کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کریں تاکہ عنداللہ و عندالناس ہم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش قرار پائیں۔

ہم اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ عام مسلمان اور ان کے ساتھ علماء نے بھی انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور اب بھی ان کی ایک بڑی تعداد کا دلچسپ مشغلہ یہی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری رائے یہی ہے جو اس سے پہلے عرض کی گئی ہے۔ محض یہ بات کہ ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے اس کے جواز کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ دین میں بلاشبہ تعامل کے اعتبار کا ایک درجہ ہے لیکن اس کے لیے اولین شرط، دین کی مطابقت ہے اگر ایسا نہ ہو تو اس کا کوئی مقام نہیں ہے خواہ یہ تعامل کیسے ہی لوگوں کا کیوں نہ ہو۔ مومن صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند ہے، دوسروں کی اطاعت اور پیروی اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس وقت جب وہ اس سے متصادم نہ ہو رہی ہو اور شریعت نے صرف اسی شرط کے ساتھ دوسروں کی اطاعت و اتباع کی اجازت دی ہے چنانچہ اسی بنا پر قرآن مجید میں منکرینِ حق کے اس مقولہ کی جا بجا مذمت کی گئی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ ان احکام کی طرف جو اللہ نے نازل کیے ہیں اور آؤ رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ جس روش پر ہم نے اپنے آباء کو پایا ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے ۔

اور ایک مومن کی حقیقی شان ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے ۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۔

کسی مومن مرد یا عورت کے لیے یہ گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو انھیں اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے ۔

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ الیکشن میں حصّہ لینے کا معاملہ تعامل کی صحیح تعریف میں آتا بھی ہے یا نہیں ۔ یہ اعتراض کرنے والے غالباً اس بات کو بھول گئے ہیں کہ اسی ہندوستان میں ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے جس میں ایک عرصہ تک علماء ہند کا عمل اس "تعامل" کے خلاف رہا ہے ۔ ترکِ موالات کے زمانہ کو ابھی زیادہ دن نہیں گذرے ہیں، غالباً ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے کہ ہندوستان کے تمام مشاہیر علماء کے دستخطوں سے ایک "متفقہ فتویٰ" شائع ہوا تھا جس میں متعدد شرعی دلائل کی بنا پر کونسلوں میں مسلمانوں کی شرکت کو ناجائز اور حرام قرار دیا گیا تھا اور یہ واضح رہے کہ یہ دلائل سب کے سب وقتی ہی نہیں تھے جو زمانہ کے بدلنے کے ساتھ بدل سکتے ہوں بلکہ ان میں سے متعدد دلائل بنیادی حیثیت رکھتے تھے جن کے آج غلط ہو جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اور نہ ہمارے علم میں کوئی ایسی بات ہی آسکی ہے جس میں ان کے غلط ہو جانے کی کوئی توجیہ کی گئی ہو درآں حالیکہ اس فتویٰ پر دستخط کرنے

والوں میں سے متعدد علماء بحمد اللہ اب بھی بقید حیات ہیں اس فتویٰ کی ایک دفعہ یہ تھی۔

"کونسل میں اکثر غیر شرعی قانون وضع کیے جاتے ہیں جس کی تحریک یا تائید یا اس پر سکوت باوجود قدرتِ مخالفت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے
قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ رَأَیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ وَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ
مسلم ممبرانِ کونسل یہ سب کچھ کرتے ہیں جس کے شواہد، واقعات ماضیہ اور خود موجودہ قوانین کا نفاذ ہے۔"

مسلمانوں کا موجودہ طرزِ عمل یقیناً اس فتوے کے اور اس کے مطابق ایک عرصہ تک جو عملدرآمد رہا ہے، اس کے خلاف ہے اس لیے یہ ایک قابلِ غور مسئلہ ہے کہ اُس وقت کا یہ فتویٰ اور اُس کے مطابق طرزِ عمل صحیح تھا یا اُن کا اِس وقت کا عمل جس کی تائید میں اب تک کوئی شرعی دلیل سوا اس "تعامل" کے ہماری نظر سے نہیں گذری ہے۔

الیکشن عقلی نقطۂ نظر سے

گذشتہ فصل میں ہم نے الیکشن کے بارے میں دینی نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی تھی، اب ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر خالص عقل کی روشنی میں غور کیا جائے کہ الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا دینی یا دنیاوی اعتبار سے کہاں تک مفید یا مضر ہوسکتا ہے۔

اگرچہ دینی حیثیت سے اس مسئلہ کی وضاحت ہو چکنے کے بعد کسی اور نقطۂ نظر سے بحث کی کوئی ضرورت یا گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے، ایک مسلمان کے لیے اصلی اور حقیقی نقطۂ نظر صرف دینی نقطۂ نظر ہی ہوسکتا ہے اس لیے جب کسی امر کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا اختیار کرنا اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف ہے، تو ایک مسلمان کے لیے اس سے علیحدہ رہنا ضروری ہو جاتا ہے خواہ اس کے اختیار کرنے سے کتنے ہی فائدے کیوں نہ پہونچنے والے ہوں اور اس کا ترک کرنا کتنے ہی نقصانات کا موجب کیوں نہ ہو۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں پھر ان کے لیے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے۔

ایمان نام ہی ہے بے چون وچرا اطاعت کا اور یہ خود قرآن مجید کی صراحت ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ

پس قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ مومن نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا

اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں پھر آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کرلیں۔

لیکن چونکہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے نزدیک دینی نقطۂ نظر کی کچھ زیادہ اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے فیصلہ کن چیز ہر مسئلہ میں صرف عقل ہے حتیٰ کہ جن لوگوں کی بحث و گفتگو دین سے شروع ہو کر دین ہی پر ختم ہونی چاہیے، وہ بھی جب اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کی گفتگو تمام تر عقلی ہی ہوا کرتی ہے اور وہ بھولے سے بھی دین کا نام درمیان میں نہیں آنے دیتے اس لیے ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اس مسئلہ پر اس حیثیت سے بھی نگاہ ڈال لی جائے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ دین جو کچھ چاہتا ہے عقل کا فیصلہ بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔

(۱) ہندوستان میں کسی قومی کشمکش کا پیدا ہونا مسلمانوں کے دینی و دنیاوی دونوں طرح کے مصالح و مفاد کے خلاف ہے بلکہ نفس اسلام کے خلاف ہے کیونکہ اسلام کسی قوم کا نام نہیں ہے اور نہ وہ دنیاوی مفادات جو قومی کشمکش کا باعث ہیں اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت رکھتے ہیں ایک مسلمان کا اصلی تعلق صرف ان اصولوں سے ہے جو اسلام نے پیش کیے ہیں اور ان کے لیے جدوجہد کرنا اس کا اصل مقصودِ زندگی ہے، باقی رہا وہ ملک و قوم جس اس کا پیدائشی حق ہوتا ہے تو وہ اس سے تعلقِ خاطر تو رکھ سکتا ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کے لیے اپنے اصلی مقصودِ زندگی کو چھوڑ نہیں سکتا اور نہ کسی درجے میں نظر انداز کرسکتا ہے۔ پس قومی نقطۂ نظر کو اصل بنا کر قومی حقوق کے لیے جدوجہد کرنا، اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی صحیح بات نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے اسلام کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ نقصان کا

اندیشہ ہے جیسا کہ اس سے پہلے مسلمانوں کے قوم پرستانہ نقطۂ نظر کی بدولت بہت کچھ پہونچ چکا ہے۔ آج ہندوستان میں اسلام غیر مسلموں کی نگاہوں میں حد درجہ مبغوض اسی لیے ہو رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا بہت دشوار ہے اور ادھر ایک عرصہ سے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق کشمکش و تصادم کا رہا ہے، اس لیے قدرتی طور پر وہ صرف مسلمانوں ہی کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کے تعلق کی بنا پر اسلام کو بھی بُری نگاہ سے دیکھنے اور نفرت کرتے ہیں۔

اسی طرح قومی حقوق کے لیے کشمکش و جنگ دنیوی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ ان کو جو حقوق اس وقت تک حاصل ہیں وہ بھی اس کشمکش کی نذر نہ ہو جائیں۔ بلا شبہ یہ بات صحیح ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ اکثریت کا جو رویہ ہے وہ بدلا جا سکتا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ لیکن یہ تبدیلی اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب مسلمان اپنی جامد قومیت چھوڑ کر پھر سے اسلامی اصولوں کو خود عملاً اپنائیں اور دوسروں کو ان کی طرف متوجہ کریں یہ اصول چونکہ اپنے اندر بھی زبردست جذبۂ کشش رکھتے ہیں اس لیے ان کو اپنا لینے کی صورت میں صورت حال موجودہ میں تبدیلی کا واقعہ ہونا تو ایک قطعی بات ہے لیکن اس کے برعکس آپ الیکشن میں اپنے قومی حقوق کی خاطر حصہ لینا چاہتے ہیں تو اس کا انجام یہی ہو سکتا ہے کہ موجودہ کشیدگی اور کشمکش میں مزید اضافہ ہو اور یہ ظاہر بات ہے کہ اس سے ان کو نقصان کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ بات حسب ذیل اقتباسات سے بھی بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔

مولانا نور الدین صاحب بہاری ناظم جمعیۃ العلماء اپنے ایک مضمون "ہندوستان

کے مسلمان کیا کریں" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ درست ہے کہ ان بزرگوں (گاندھی جی اور کانگریس ہائی کمانڈ کے "چند برگزیدہ وسیع الدماغ بزرگ") نے نیک نیتی سے اس ملک کو جمہوری سکولر قرار دیا، مگر اس سے زیادہ یقینی یہ ہے کہ ملک کے باشندوں کا دماغ نہ سکولر ہے نہ جمہوری اور شاید اس ذہنیت کے پیدا ہونے میں عرصہ لگے۔ اگر اس مسئلہ کو اس طرح الجھاؤ میں رکھا گیا تو میرا یقین ہے کہ الیکشن کے زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی اتنی بھیانک ہوگی جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی حکومت اپنے لا اینڈ آرڈر کو اس وقت برسر کار لاسکتی ہے جبکہ اس کے نیچے کا عملہ حکومت کی پالیسی سے دیانت دارانہ تعاون کرے، مگر ہمیں اس کا اقرار کرنا چاہیے کہ آج نیچے کے عملہ کی اکثریت حکومت کی پالیسی کی وفادار نہیں اور خصوصاً اس مسئلہ میں...... پس اس تباہ کن پوزیشن میں نہایت سنجیدگی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو غور کرنا ہے کہ آیا اس حق کو جو ملک کی برسرِ اقتدار پارٹی نے مسلمانوں کو دیا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے یا موجودہ ماحول و ذہنیت کے پیشِ نظر اس وقت تک کے لیے جب تک ملک کی اکثریت کی ذہنیت جمہوری اور سکولر کے ڈھانچے میں نہ ڈھل جائے اس وقت تک اس حق سے دست بردار ہوجایا جائے ...... میری دیانت دارانہ سیاسی رائے ہے کہ تمام ملک کے مسلمانوں کو قطعاً اس حق سے دست بردار ہوجانا چاہیے اور آئندہ الیکشن میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا مقصدِ زندگی سیٹ اور عہدوں کا حصول ہے شاید

وہ اس رائے سے متفق نہ ہوں گے حالانکہ موجودہ فضا میں اس کی کامیابی کی کوئی راہ نظر نہیں آتی پھر بھی وہ دست بردار نہ ہوں گے اس لیے میں تمام مسلم عوام سے جو ووٹر ہیں درخواست کروں گا کہ وہ اعلان کر دیں کہ جب تک ملک کی ذہنیت جمہوری سکولر نہ بنے گی ہم اس حق کو جو مسلمانوں کو دیا گیا ہے استعمال نہ کریں گے میرے نزدیک موجودہ فضا میں اس سے بہتر تباہی سے بچنے کی اور کوئی راہ نہیں ہے" (ریج ۹ر اپریل ۱۹۵۰ء)

مولانا حامد الانصاری صاحب غازی نے جمعیۃ العلماء جون پور کے اجلاس میں اپنا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"ہندو رہنما ۲۸ کروڑ ہندوؤں کی نئی تخلیق کا کام اپنے ویدوں اور دھرم شاستروں کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، ہر نئی قوم کو نئی مہم کے لیے ایک نشانہ کی ضرورت ہوتی ہے ان لوگوں کے فیصلہ کے مطابق یہ نیا نشانہ ہندوستان کے ۴ کروڑ مسلمان ہیں اور اس نشانہ پر ہندو قوم کو جمع کرنا ان کا نصب العین ہے۔ (گئو رکشا، جبریہ ہندی، کلیدی ملازمتوں سے مسلمانوں کی علیحدگی وغیرہ نعروں کو بطور مثال کے پیش کرنے کے بعد) یہ تمام باتیں صرف اس لیے آناً فاناً کی گئیں تاکہ مسلمان نشانہ بن سکیں اور تمام ہندوؤں کو اس نشانہ پر جمع ہونے کا موقع مل سکے ...... سوال یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی عقل کا فیصلہ کیا ہونا چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہمارے دماغ کا فیصلہ یہی ہونا چاہیے کہ ہم نشانہ سے ہٹ جائیں اور نشانہ کو خطا ہونے کا موقع دیں اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم کم سے کم عبوری دور کے لیے سیاست سے مکمل دست برداری کی دستاویز پر دستخط کر دیں اور اپنی تعمیر و ترقی کے کام میں

اس طرح گم ہو جائیں کہ اگر کوئی ہم کو اپنا نشان بنانے کے لیے تلاش بھی کرنا چاہے تو ہم اسے دستیاب نہ ہو سکیں ۔ (مدینہ ۹ مارچ سنہ ۱۹۵۰ء)

(۲) ہمارے نزدیک مسلمانوں کو اس وقت ہندوستان میں جو مصیبتیں درپیش ہیں ان کا ایک بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اب بھی ہندوستان میں اس حیثیت کے مالک ہیں کہ ان کے ووٹ الیکشن پر بہت کچھ اثر انداز ہو سکتے ہیں ۔ ان کی اس حیثیت کو بہت سے لوگ ان کے لیے فالِ نیک سمجھتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے حالات میں ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک ملک کے موجودہ حالات میں ان کی یہ حیثیت ان کے لیے بلائے جان ثابت ہو رہی ہے ۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے تحت یہ سمجھا جا رہا ہے ـــــ اور یہ حقیقت سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے ۔ کہ مسلمانوں کی اکثریت ، ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں میں سے بعض سے زیادہ قریب اور بعض سے بہت زیادہ دور ہے اور اسی اعتبار سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کی تائید یا مخالفت کا کیا اندازہ ہو گا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو پارٹیاں اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کی تائید و حمایت کسی حال میں حاصل نہیں ہو سکے گی وہ اس بات کے لیے رات دن کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کو ہر ممکن ذریعہ سے تنگ اور پریشان کیا جائے اور اس سے گوناگوں فوائد ان کے پیشِ نظر ہیں ۔

پہلا فائدہ اس کا یہ ہو گا کہ مسلمان پریشان ہو کر ترکِ وطن کریں گے اور اس طرح ان کے مخالفین کے ووٹ کم ہوتے رہیں گے ۔

دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ جو مسلمان یہاں رہنا ہی چاہیں گے وہ ان سے خوف زدہ ہو کر یا تو ان کا ساتھ دیں گے یا کم از کم ان کے مخالفین کی حمایت نہیں کریں گے اور

یہ دونوں صورتیں الیکشن میں ان کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔

اور تیسرا زبردست فائدہ اس سے ان کو یہ پہونچے گا کہ وہ اس کی وجہ سے عام پبلک میں جو بدقسمتی سے سخت فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار ہے "نیک نام" ہوں گے اور اس سے ان کی آئندہ کامیابی کی راہیں ہموار ہوں گی۔

اور چوتھا فائدہ یہ ہے کہ فسادات کی وجہ سے کانگرس کی طرف سے مسلمانوں کا اعتماد متزلزل ہوگا اور یہ چیز بالواسطہ طور سے ان کے لیے مفید ہوگی۔

چنانچہ ملک کی یہ جماعتیں ان ہی فوائد کے لیے تقسیم سے لے کر اس وقت تک برابر اپنی فتنہ انگیزیوں میں مصروف ہیں اور اس وقت تک جتنے فسادات بھی ہوئے ہیں ان سب میں ان کا زبردست ہاتھ رہا ہے اور یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، جو لوگ حالات سے ذرا بھی لگاؤ رکھتے ہیں وہ اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ تاہم ہم ذیل میں ایک غیر مسلم صاحب قلم کے ایک مضمون کا اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ہم نے فسادات اور ان کے اسباب کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس سے غیر متعصب "صاحب البیت" بھی متفق ہیں۔

اونکار ناتھ شاستری نے گذشتہ سال کے فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں جو "نیا ہند" (الہ آباد) میں شائع ہوا تھا لکھا تھا:۔

"ہندوستان میں سامپردایک (فرقہ وارانہ) دنگے کرانے میں ان جماعتوں (فرقہ پرست جماعتوں) کو کئی فائدے دکھائی دیتے ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کی اب بھی کافی تعداد ہے اور ان کے ووٹ چناؤ پر کافی اثر ڈال سکتے ہیں، مہاسبھا جانتی ہے کہ وہ ان کے ووٹ نہ حاصل کر سکے گی، اس لیے اگر مسلمان یہاں

سے چلے جائیں تو اس کا کام بن سکتا ہے، مسلمانوں کو نکالنے کے لیے اس نے پہلے تو یہ نعرہ لگایا کہ آبادی کی ادلا بدلی کرلی جائے، پھر اس نے جنگ کا نعرہ لگایا اور جب یہ دیکھا کہ ہندوستان اور پاکستان ابھی مونڈھ نہیں کریں گے تو اپنی ساری کوشش اس بات میں لگادی کہ ہندوستان بھر میں ہندو مسلم دنگے ہوجائیں۔

آبادی کا تبادلہ ہونے پر کروڑوں آدمیوں کو کن کشٹوں کا سامنا کرنا پڑتا اس سے اسے کوئی غرض نہیں اور جنگ میں ہندوستان و پاکستان میں کتنی تباہی و بربادی ہوتی اس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا مقصد تو کسی طرح مسلمانوں کو یہاں سے نکال کر ان کے بدلے میں آنے والے ہندوؤں سے یہ کہہ کر ان کے ووٹ حاصل کرنا تھا کہ دیکھو کانگرس تمھارا خیال نہیں کرتی تھی۔ ہم نے تمھیں مسلمانوں کی غلامی سے چھٹکارا دلایا، اس کا آخری حربہ ہندو مسلم دنگے تھے، کیونکہ یہاں دنگوں میں جو ہندو حصہ لیں گے، وہ نہ صرف مسلمانوں کی جان لیتے بلکہ ان کا مال بھی لوٹتے اگر اس لوٹ میں ان کے ہاتھ کچھ مال آجاتا اور وہ پکڑے نہ جاتے تو مہا سبھا یہ کہتی کہ میرے کارن تمھیں یہ لابھ ہوا اور اگر سرکار انھیں روکتی یا پکڑتی تو مہا سبھا ہندوؤں کو یہ سمجھاتی کہ کانگریس تمھاری دشمن اور مسلمانوں کی دوست ہے، اسی طرح جن ہندوؤں کو سرکار گرفتار کرتی مقدمہ چلاتی اور سزا دیتی، ان کے سمبندھیوں (متعلقین) کے دل میں آپ ہی آپ سرکار اور کانگریس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی۔ غرض ہر حالت میں مہا سبھا اپنا فائدہ ہی سوچتی تھی۔"

اقتباس بالا کو پیشِ نظر رکھنے سے اس بات میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں

رہ جاتی کہ ہمیں آئینِ ہند میں شہریت کا جو یہ حق دیا گیا ہے کہ ہم الیکشن میں مساویانہ حصّہ لے سکیں وہ ہمارے خوش ہونے کے لیے تو بہت اچھا ہے لیکن اس کا استعمال ہمارے لیے بہت سے خطرات کا سرچشمہ ہے۔ اور اس کے بعد غالباً یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں اپنی عافیت مطلوب ہے تو ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اپنے اس حق سے خود اپنے ارادے سے دست بردار ہو جائیں، اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو کم سے کم فرقہ پرستوں کی ان چیرہ دستیوں سے جن کا آئے دن ان کو شکار ہونا پڑتا ہے ان کو نجات مل سکتی ہے۔

میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو تھوڑا بہت سکون آپ کو نظر آرہا ہے اس کی وجہ سے آپ کچھ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان فرقہ پرستوں کی ذہنیتوں میں کوئی فرق واقع ہو گیا ہے، اول تو اس وقت ملک میں روٹی اور کپڑے کے مسائل نے وقتی طور سے اہل ملک کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے، جس میں فتنہ و فساد کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت نہ بانیانِ فساد کو ہے اور نہ عام پبلک کو۔ دوسرے ابھی الیکشن غیر یقینی ہونے کے ساتھ کچھ دور بھی ہے، اس لیے اس وقت صرف تیاریوں کا زمانہ ہے، مناسب وقت آنے پر جب جدوجہد تیز کرنے کی ضرورت پیش آئے گی تو یہ جدوجہد بھی تیز کر دی جائے گی۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ اس وقت بھی اس کا سلسلہ کچھ بند نہیں ہے کچھ نہ ہونے پر بھی ۱۸ دسمبر ۱۹۵۰ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء تک یعنی صرف ڈیڑھ ماہ میں یوپی، سی پی، اور بہار وغیرہ میں سات جگہ فسادات برپا ہو چکے ہیں جن کا سبب آئندہ الیکشن کی تیاریاں ہیں اور یہ بات وزیر اعظم ہند تک کو تسلیم ہے شعیب (حیدر آباد) نے ابھی حال میں لکھا ہے۔

لہ۔ یہ سطریں فروری ۱۹۵۱ء میں لکھی گئی تھیں اس کے بعد جو واقعات پیش آرہے ہیں ان سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

"وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کے پورے احساس کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ حال ہی میں ہندو مہا سبھا نے فرقہ وارانہ فسادات کرانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ افواہیں پھیلا کر فسادات کا ایک نیا دور شروع کرانے کی سازش اس لیے کر رہی ہے کہ اصول، نظریہ اور عمل کے میدان میں تو وہ کانگریس کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر فرقہ وارانہ فضا بگاڑ کر اگلے انتخاب میں ووٹ ملنے کی امید کر سکتی ہے اور غالباً یہ توقع بھی کر سکتی ہے کہ اگر فسادات پھیلائے جائیں تو مسلم اقلیت بھی کانگریس پر بھروسہ ترک کر کے مہا سبھا کو نہ سہی دوسرے حریف عناصر کو ووٹ دے گی اور اس طرح مہا سبھائی امیدوار بالواسطہ فائدہ اٹھائیں گے۔"

پھر ان فتنہ پرور جماعتوں کی ان فتنہ پروریوں کے ساتھ یہ بات بھی آپ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تقسیم ملک کے بعد ان کے لیے یہاں کی فضا کتنی سازگار ہو گئی ہے اور اب ان کے اثر و اقتدار کا کیا حال ہے۔ عوام میں ان کو جو مقبولیت ہے اس کے تو خیر اسباب موجود ہیں لیکن خود حکومت میں ان کے اثر و اقتدار کا حال یہ ہے کہ اوپر وزیر ہند کی جس تقریر کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح کی تقریریں خود حکومتی محکمہ یعنی ریڈیو کے ذریعہ ملک میں نشر نہیں ہو پاتی ہیں جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود حکومت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نہیں چاہتے کہ ان جماعتوں کے خلاف ملک میں مخالفت کا کوئی جذبہ پیدا ہو اور وہ اس کے لیے وزیر اعظم کی تقریروں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، ان جماعتوں کی اس حیثیت کو ذہن میں رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ محض مسلمانوں کا ووٹ اس وقت ان کی کتنی مصیبتوں کا باعث بنا ہوا ہے اور اس پر اس وقت کی حالت کو بھی قیاس کر لیجیے جب انتخابات کی سماہمی عملاً شروع ہو جائے گی اور مسلمانوں کی حمایت یا مخالفت جو ابھی درجۂ احتمال و امکان میں ہے الیکشن میں حصہ لینے کی صورت میں

کھل کر سامنے آجائے گی اس وقت اس کا مخالفین پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے بلکہ واقعہ تو یہ ہے اگر یہی لیل و نہار رہے تو شاید اس وقت اُس وقت کی تباہیوں کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے، خدا کرے ہم جن باتوں کا اندیشہ کرتے ہیں ان میں سے کوئی بات بھی پیش نہ آئے، ہماری خوشی یقیناً اس میں ہے کہ اس بارے میں تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوں اور ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ غیب کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے اور کارسازِ حقیقی کی کارسازیاں ہر قسم کے ظن و تخمین سے بالاتر ہیں، اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ از غیب ایسے اسباب فراہم کر دے جن کی وجہ سے یہ حالات چشم زدن میں یکسر بدل جائیں، لیکن اگر نخواستہ مسلمانوں کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جس کا ایک اہم جزیہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی صحیح حیثیت کو پہچانیں اور اس کے تحت الیکشن سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کریں تو اس وقت حالات کے پیش نظر انتہائی پُر اُمید نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مولانا نورالدین صاحب بہاری کے یہ الفاظ ہمارے ذہن و دماغ میں گونجنے لگتے ہیں۔

> "اگر اس مسئلہ کو اسی طرح الجھاؤ میں رکھا گیا تو میرا یقین ہے کہ الیکشن کے زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی اتنی بھیانک ہوگی جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جا سکتا" (لا سامح اللہ)

(۳) الیکشن میں حصہ لینے کی تین ہی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی شکل یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت جماعت الیکشن میں حصہ لیں اور اپنے طور سے امیدوار کھڑے کریں، دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے امیدوار علیحدہ کھڑے نہ کریں بلکہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کر لیں اور پھر اس کے ساتھ مل کر الیکشن جیتنے کی جد و جہد کریں اور تیسری شکل یہ ہے کہ مسلمان متحد ہونے کے بعد اگر بحیثیت قوم کسی پارٹی سے کوئی سمجھوتہ نہ کر سکیں تو کسی منظم طریق کے مطابق

الگ الگ ٹولیوں میں مختلف پارٹیوں میں شریک ہوں لیکن یہ تینوں شکلیں مسلمانوں کے لیے غیر مفید بلکہ مضر ہیں جیسا کہ اس سے پہلے ہم تفصیل سے قومی تنظیم کے ضمن میں واضح کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ووٹ کا استعمال

گذشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ الیکشن میں حصّہ لینے کی جتنی ممکن شکلیں ہیں ان میں کوئی شکل بھی ایسی نہیں ہے جسے اختیار کر کے مسلمان دینی یا دنیاوی حیثیتوں سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں، اب اس بحث کے بعد صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمان اگر آئندہ الیکشن میں کسی طرح خود امیدوار کی حیثیت سے کھڑے نہ ہوں تو وہ اپنے ووٹ دوسرے امیدواروں کے لیے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں اور ایسا کرنا ان کے لیے کہاں تک مفید یا مضر ہو سکتا ہے۔

اس بارے میں بھی ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ الیکشن میں حصّہ لینے کی یہ شکل بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے بلکہ بہت زیادہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

پہلا نقصان تو یہی ہے کہ اس شکل میں مسلمان مختلف پارٹیوں کی آماجگاہ بن جائیں گے اور اس کشمکش میں ان کو نقصان کے سوا فائدہ کچھ نہیں پہونچ سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی تنظیم نہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے ووٹ مختلف پارٹیوں کے لیے تقسیم ہو جائیں گے اس لیے وہ کسی پارٹی کو خوش نہ کر سکیں گے اور اور نہ اس سے کوئی دنیاوی منفعت حاصل کر سکیں گے بلکہ اس کے برخلاف یہ بات بہت سی پارٹیوں کی ناخوشی کا موجب ہوگی اور اس سے بحیثیتِ قوم ان کو نقصان پہونچے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اوپر جو وجوہ اُمیدوارانہ بننے کے سلسلہ میں مذکور ہوئے ہیں۔

وہ اس بات کے بھی متقاضی ہیں کہ مسلمان ووٹر کی حیثیت سے بھی الیکشن میں حصہ نہ لیں، مثلاً اگر مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ کسی باطل نظام کے تحت قائم شدہ اسمبلی کی ممبری کے لیے امیدوار بنیں تو ان کے لیے یہ بھی ناجائز ہوگا کہ وہ اس کے لیے کسی اُمیدوار کی تائید بھی کریں، اور اسی پر دوسرے وجوہ کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ان اسباب کے تحت ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو ووٹر کی حیثیت سے بھی آئندہ انتخاب سے علیحدہ ہی رہنا چاہیے، باقی رہی یہ بات کہ مولانا نورالدین صاحب کے بقول جن لوگوں کا مقصدِ زندگی سیٹ اور عہدوں کا حصول ہے۔ وہ بہرحال انتخابات میں کود یں گے اور اپنے ذاتی اغراض کے لیے وہ مسلمانوں کو بھی اس آگ میں جھونکنے کی کوشش کریں گے، تو یقیناً ایسا ہوگا اور ہم اور آپ ایسے لوگوں کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے، اس لیے اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے البتہ اگر آپ ہمارے نقطۂ نظر سے متفق ہیں تو آپ کو چاہیے کہ اپنی حد تک اس سے الگ رہنے کی کوشش کریں۔

الیکشن سے علیحدگی کے متوقع نقصانات

گذشتہ مباحث میں ہم نے شرعی اور عقلی دونوں طرح کی دلیلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا دینی حیثیت سے غلط اور دنیاوی اعتبار سے ہر طرح کے نقصانات کا موجب ہے ہمارا خیال ہے کہ ان مباحث کے بعد اب اس بات کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی ہے کہ ہم الیکشن کی علیحدگی کے نقصانات کا الگ الگ جائزہ لیں اور ان پر گفتگو کریں لیکن چونکہ الیکشن سے علیحدگی کا تصور کرتے ہی طرح طرح کے نقصانات کا ایک بھیانک منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ اچھے اچھوں کے قدموں میں بھی لغزش پیدا کر دیتا ہے اس لیے مناسب نہ ہوگا کہ ہم خاص خاص نقصانات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ کہاں تک اہم ہیں اور الیکشن میں حصہ لینے کے جو نقصانات ہم بیان کر چکے ہیں ان کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔

انفرادی نقصان

کچھ نقصانات تو ایسے ہیں جن کو آپ زیادہ سے زیادہ افراد کا انفرادی نقصان قرار دے سکتے ہیں مسلمانوں کے عمومی نفع و نقصان سے جس سے اس وقت ہم بحث کرنا چاہتے ہیں ان کا کوئی لگاؤ نہیں ہے، مثلاً اسمبلیوں کی ممبری بہت سے لوگوں کے لیے عزت و شہرت کا ذریعہ ہے، ان کو ممبر بننے کے بعد کچھ مستقل یا غیر مستقل وظیفے اور الاؤنس وغیرہ بھی ملنے لگتے ہیں جو بہتوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسمبلی کے ممبر ہونے کے بعد پارلیمنٹری سکریٹری یا وزیر وغیرہ بنا لیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ان فوائد میں سے

کوئی فائدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے لیے وہ دینی اور دنیاوی فوائد قربان کر دیئے جائیں، جو علیحدگی سے پہونچ سکتے ہیں اور جن کی مختصر توضیح اوپر کی جا چکی ہے اور نہ یہ فوائد ان نقصانات کی کسی درجہ میں تلافی کر سکتے ہیں، جو الیکشن میں حصہ لینے سے لازمی طور پر پہونچیں گے اور ان کا دائرہ صرف افراد تک محدود نہیں ہوگا بلکہ وہ پوری اُمّتِ مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے ایسی حالت میں کیا یہ انتہائی حماقت نہ ہوگی کہ ہم محدود افراد کے انفرادی فائدوں کی خاطر پوری ملت کے نفع ونقصان سے بے پرواہ ہو جائیں اور فائدے بھی ایسے کہ باوقار اور غیور قوم کے لیے ان فوائد کو معرضِ بحث میں لانا بھی درحقیقت اس کی انتہائی ذلت کے مترادف ہے!

نمائندگی کا عذر

کچھ لوگ الیکشن کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ممبروں کے ذریعہ اپنی آواز اربابِ اختیار کے کانوں تک پہونچا سکتے ہیں اور اس طرح ان کو اپنے حقوق ومطالبات کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، یا اگر کچھ مسلمان وزارت کے عہدوں پر پہونچ جائیں تو وہ اپنے ذاتی اختیارات یا اثر واقتدار کے ذریعہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ہمارے وہبی حقوق اپنے دائرہ اختیار کے اندر دلوا سکتے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل بھی بے وزن ہے۔

اول تو ہندوستان کا آئندہ الیکشن مخلوط بنیادوں پر ہوگا، اس لیے جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کسی ایسے مسلمان نمائندے کی کامیابی بہت مشتبہ ہے جو اسمبلی میں جا کر واقعی مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے، مخلوط انتخاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہوگا بلکہ عام رائے دہندگان کا نمائندہ ہوگا جس میں اکثریت بہرحال غیر مسلموں کی ہوگی اور اس عمومی نمائندگی کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی شروع امیدواری سے لے کر اسمبلی کی ممبری

اور اس کے بحث و مباحثہ اور کسی مسئلہ پر رائے دینے کے ہر مرحلہ پر نہایت شدت کے ساتھ اپنی اس عمومی حیثیت کو برقرار رکھنا پڑے گا، ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ اول تو الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکے، یا اگر کامیاب ہو جائے تو اسے اپنی "نالائقی" کا احساس یا تو اسمبلی کو قبل از وقت چھوڑ دینے پر مجبور کر دے یا پھر اس کو مجسمۂ سکوت بنا دے کہ وہ سب کچھ دیکھتا رہے لیکن کبھی زبان ہلانے کی جرأت نہ کرے، اور یہی بات مسلم وزیروں کے بارے بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ مسلمان ہونے کی بنا پر وزیر نہیں بنائے جاتے بلکہ پارٹی کے ممبر ہونے کی بنا پر منتخب کیے جاتے ہیں اور ان کے انتخاب میں اس عام اصول کے علاوہ کہ پارٹی کے ساتھ ان کے اخلاص و وفاداری کا کیا درجہ ہے ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر ان کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی سیکولر جمہوری اسٹیٹ میں پوری طرح موزوں ثابت ہو سکتے ہیں یا نہیں اور تجربہ بتلاتا ہے کہ مسلمان وزراء ——— اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ ——— اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس معیارِ انتخاب پر پورے اتریں اور انتخاب کنندگان کو ان کی وجہ سے قوم اور ملک کے سامنے رسوا ہونا نہ پڑے اور وہ اپنی اس کوشش میں "اللہ کے فضل" سے پوری طرح کامیاب بھی ہیں، یہ لوگ اپنے عام حالات میں سیکولر جمہوری اسٹیٹ کے انہی مفہوم کو سامنے نہیں رکھتے ہیں۔ جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ جمہور کے ذہن میں ان الفاظ کا جو مطلب ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی صریح حق تلفیوں کو بھی وہ ہنسی خوشی گوارا کر لیتے ہیں اور اس بات کے لیے وہ پوری طرح کوشاں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی خاص لگاؤ کسی طرح ظاہر نہ ہو سکے، ورنہ انتخاب کنندگان کی نظرِ انتخاب کی توہین ہو گی، اور کیا عجب کی وجہ سے وہ ان کی نظرِ التفات سے بھی محروم ہو جائیں اور اس طرح مسلمانوں کی "خدمت" کا یہ ذریعہ بھی جاتا رہے۔ ہندوستان میں اس وقت بھی مسلم

وزیروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی شکایات روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہیں اور یہ وزرا، ان پر اس طرح خاموش ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے، آپ ان ہی وزرا، پر اپنے مستقبل کے وزرا، کو بھی قیاس کر سکتے ہیں، بلکہ اس وقت جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے وہ شاید ویسے بھی ثابت نہ ہو سکیں جیسے اس وقت کے وزرا ہیں اور اس کے وجوہ ظاہر ہیں۔

دوسری بات جو اس ضمن میں اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ یہ خیال سراسر احمقانہ ہے کہ کسی قوم کے حقوق و مطالبات کا تحفظ اس پر موقوف ہے کہ اس کے کچھ لسان القوم ہوں جو اس کی باتیں اربابِ اختیار تک پہونچا سکیں اگر اربابِ اختیار ایسے ہوتے کہ عرض و معروض کے بغیر آپ کی مشکلات و مصائب سے آگاہ نہ ہو سکتے اور محض ناواقفیت کے نتیجہ میں آپ کے حقوق تلف ہوتے یا آپ پر زیادتیاں سرزد ہوتیں جیسا کہ پچھلے زمانوں میں ہوا کرتا تھا تو یقیناً اس کی ضرورت تھی کہ آپ اپنی باتیں ان تک پہونچانے کا کوئی انتظام سوچیں لیکن یہ زمانہ پچھلے زمانوں سے بالکل مختلف ہے اربابِ اختیار جاہل اور ناواقفِ حال لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو ایک ایک بات کی خبر ہے اور ان کے ذرائعِ علم ایسے وسیع ہیں کہ وہ چاہیں تو آپ کی نجی گفتگوؤں کا بھی حال معلوم کر لے سکتے ہیں، اس لیے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کی شکایات کے ازالہ کے لیے بس اتنی بات کافی ہے کہ کسی طرح وہ اربابِ اختیار کے کانوں تک پہونچ سکیں، بلکہ وہ اس بات پر موقوف ہے کہ آپ کے اندر اپنی بات منوانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔ بالفاظِ دیگر آپ کے معاملات کا فیصلہ اسمبلیوں کے اندر نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کے فیصلے کی اصل جگہ اسمبلیوں کے باہر ہے۔

اگر آپ نے اپنی حالت ایسی بنالی کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کا وزن محسوس کیا جائے تو چاہے آپ زبان سے کچھ نہ کہیں وہ بات پوری ہو کر رہے گی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو چاہے آپ سب کے سب اسمبلیوں میں پہونچکر شور و غل مچائیں سو ڈانٹ پھٹکار کے آپ کو کچھ میتسر نہیں آئے گا۔ خود کانگریس کی پچھلی تاریخ اس حقیقت کی ترجمان ہے۔ اس کی آواز اس وقت کے ایوانِ اقتدار میں اس وقت سُنی گئی جب اس نے اسمبلیوں سے باہر رہ کر اپنے اندر یہ قوّت پیدا کرلی کہ اس کی بات سنی جائے، ورنہ اس سے پہلے یہی ہوتا رہا ہے کہ اگرچہ کچھ لوگوں نے پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں اس اصولِ عام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسمبلیوں کا رُخ کیا تو بہت جلد ان کو معلوم ہوگیا کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی شکایات محض اس لیے نہیں ہیں کہ کوئی اس کی بات ان کے کانوں تک پہونچانے والا نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ کچھ اپنی ہی کمزوریوں میں چھپی ہے۔ پنڈت جی اور ان کے ساتھیوں کی پرجوش تقریروں سے اکثر ایوانِ اسمبلی لرزاٹھا کرتا تھا، لیکن پرنالہ گرنے کی جو جگہ متعین تھی اس میں ان تقریروں کے ذریعہ سرِ مو فرق واقع نہیں ہوتا تھا اور ایک بار پھر اسی طرح کی غلطی خود کانگریس نے اپنی سرکاری حیثیت میں کی تھی یعنی اس نے وزارتوں پر قبضہ کے ذریعہ اپنا کام نکالنا چاہا تھا لیکن اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور بہت جلد اس کو سب کچھ چھوڑ کر اپنے اسی میدانِ عمل میں واپس آنا پڑا جہاں کی ہر بات پر واقعی دھیان دیا جاتا ہے اور جس کو خالی چھوڑ دینے سے بڑی سے بڑی آواز میں بھی کوئی قوت نہیں ہوتی ہے، اور نہ اس کی طرف کوئی دھیان دینے والا ہوتا ہے۔

پس ہمارے نزدیک اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کی آواز واقعی اربابِ اختیار کے

کانوں تک پہونچے اور سُنی جائے تو اس کی حقیقی تدبیر یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی آواز ایسے گراموفونوں میں بند کرنے کی کوشش کریں جو اپنی مرضی سے بول بھی نہ سکتے ہوں، اس طرح کے گراموفون، لوگوں کی تفریح کا ذریعہ تو ضرور بن سکتے ہیں، لیکن ان کی آواز ارباب کار کو آپ کے حقوق و مطالبات کی طرف متوجہ نہیں کر سکتی، اس کے لیے آپ کو اس کے ماسوا کچھ کرنا پڑے گا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیے یہ طریقِ عمل بعینہ وہی طریقِ عمل ہے جو اب تک مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اختیار کرتے رہے ہیں، لیکن جس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا ہے۔ ہندوستان میں ایک عرصہ سے مسلمانوں کی سیاست کا محور یہی رہا ہے کہ وہ کسی طرح اسمبلیوں میں زیادہ سے زیادہ حقِ نمائندگی حاصل کریں، اور وزارتوں میں ان کا زیادہ سے زیادہ حصّہ ہو، اس کی خاطر انھوں نے خوشامدوں کی ذلّت بھی گوارا کی اور مخالفتوں اور لڑائیوں کا خطرہ بھی مول لیا، اور بالآخر اس مقصد میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، چنانچہ تقسیم سے پہلے ان کو غیر منقسم ہندوستان کی وزارتوں اور اسمبلیوں کی ممبریوں کا اس سے زیادہ حصّہ حاصل رہا ہے جس کے وہ اپنے تناسبِ آبادی کے لحاظ سے مستحق ہو سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود کیا واقعہ نہیں ہے کہ یہ باتیں ان کے درد کا درماں نہ بن سکیں، اور ہر کامیابی کے بعد ان کو پہلے سے زیادہ اپنی ناکامی کا احساس ہوتا گیا تا آنکہ آخری چارۂ کار ان کو یہی نظر آیا کہ وہ اپنے لیے ایک علیحدہ مامن پاکستان کی شکل میں حاصل کریں ـــ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لیے خیر و برکت کا موجب ثابت ہوا، یا اس سے ان کے قومی مسائل اور زیادہ الجھ گئے ہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے جس سے یہاں تعرض

کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے کم از کم یہ بات واضح ہے کہ وزارتیں اور ممبریاں اس ملک میں جہاں ان کی حیثیت ایک نہایت کمزور اقلیت کی ہو کوئی زیادہ سودمند چیز نہیں ہے۔ تو کیا ہندوستان کے مسلمان اسی آزمائے ہوئے نسخہ کو پھر آزمانا چاہتے ہیں۔ اور اس کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے یہ تدبیر اس وقت بھی صحیح اور کارگر نہیں تھی لیکن اب تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس تدبیر کا سہارا ڈھونڈھنا ان کو بالکلیہ ترک کر دینا چاہیے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اس زمانہ میں قومی حقوق و مطالبات پر زور دینا اور وہ بھی قوم پرستانہ طریقوں کے ذریعہ، یہ ان حقوق کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔ ان کے لیے صحیح بات تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اب اپنا صحیح مقام سمجھتے ہوئے خود ہی اپنے قومی حقوق و مطالبات کی فہرست پر نظر ڈالیں اور جو باتیں ان کی اصلی حیثیت کے مطابق ہیں ان کو پوری قوت سے برقرار رکھنے کی کوشش کریں اور بقیہ کو نظر انداز کر دیں لیکن اگر ابھی ان پر اپنی اصلی حیثیت واضح نہیں ہوئی ہے اور وہ اپنی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر انھیں اپنے حقوق و مطالبات کے منوانے کے لیے کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے، یہ اسمبلیوں کی نمائندگی تو اس کے لیے کچھ بھی سودمند نہیں ہے۔

خطرات سے تحفظ کا فریب

الیکشن سے علیحدگی کا ایک اور زبردست نقصان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں کوئی ایسی پارٹی برسرِ اقتدار آجائے گی جو مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی اور اس وقت مسلمانوں کو جو سہولتیں اور آزادیاں حاصل ہیں وہ بھی اس کے تحت ختم

ہو جائیں گی، اس لیے آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کو پوری قوت وہمت کے ساتھ حصہ لینا چاہیے اور ان پارٹیوں میں سے نسبتاً کسی بہتر یا کم خطرناک پارٹی کو منتخب کرکے اس کو کامیاب بنانے بنانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

الیکشن کی حمایت میں اس وقت جتنی دلیلیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ان سب میں مذکورۂ بالا دلیل باعتبار اثر ایک خاص امتیاز رکھتی ہے لیکن اس اثر کی وجہ کچھ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہ اس دلیل میں کوئی وزن ہے، وزن تو کیا فی نفسہ یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے، جیسا کہ آپ کو آئندہ معلوم ہوگا، البتہ چونکہ یہ دلیل خوف زدہ مسلمانوں کی ذہنیت سے مطابقت رکھتی ہے اس لیے اس طرح کے مسلمانوں پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر پڑنا ناگزیر ہے۔

تقسیم کے بعد سے اس وقت تک مسلمان مختلف قسم کی آفات ومصائب کے شکار رہے ہیں اور آئندہ بھی ان کو اپنے لیے ہر طرف خطرہ دکھائی پڑ رہا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے اپنی کم نگاہی یا بدحواسی کی وجہ سے یہ سمجھ لیا ہے — اور بدقسمتی سے یہی عام طور سے ان کو سمجھایا بھی جاتا ہے کہ ان کو جو کچھ بھی مصیبتیں ہندوستان میں پیش آرہی ہیں، وہ محض یہاں کی بعض پارٹیوں کے غلط طرزِ عمل کا نتیجہ ہیں اور ان کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے کہ وہ انہی پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کے دامنِ عطوفت میں پناہ لیں، اس لیے یہ بالکل فطرتی بات ہے کہ خوف زدہ مسلمان امن وسکون کی تلاش میں ہر اس راستہ پر دوڑیں جس کو ان کے نجات کا راستہ قرار دیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کوئی راستہ محض ظن وگمان کی بنا پر امن وسکون کا راستہ نہیں بن جائے گا اور نہ ان کی خوش گمانیوں سے ان کی خطرناکیاں ان کے حق میں

راحت وسکون کا ذریعہ بن جائیں گی بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی اس سراسیمگی اور سرگشتگی کی حالت میں کسی ایسے راستہ کو اپنے لیے راہِ نجات فرض کرلیں جس پر چل کر ان کی مصیبت ختم ہونے کی بجائے اور زیادہ سخت اور سنگین ہوجائے اور بعد میں ان کو پچھتانے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو سکے۔

ہمارے نزدیک الیکشن میں حصّہ لے کر کسی بہتر پارٹی کو برسرِاقتدار لانے کی کوشش کی بھی حیثیت یہی ہے۔ یہ ان کی بدحواسی کا سوچا ہوا نسخہ ہے اور اس سے فائدہ کی بجائے اُن کو اور زیادہ الٹا نقصان پہنچنے والا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ الیکشن میں حصّہ نہ لینا اگر اس پہلو سے خطرناک ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہم کسی خطرناک پارٹی کے زیرِ اقتدار آجائیں گے اور یہ خطرہ ہمارے لیے بہت سے خطرات کا پیش خیمہ ہے، تو ہمارے نزدیک فی نفسہٖ الیکشن میں حصّہ لینے سے جو خطرات پیش آئیں گے وہ ان خطرات سے بدرجہا زیادہ خطرناک ہیں اس لیے اگر آپ خطرات سے اپنا تحفظ چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے آپ الیکشن میں حصّہ لینا چاہتے ہیں — دراں حالیکہ اس کی شرعی اور دینی حیثیت آپ پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ کسی طرح آپ کے لیے جائز نہیں ہے — تو آپ اس خطرہ کے نقطۂ نظر ہی کے تحت فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کے لیے الیکشن میں حصّہ لینا زیادہ مفید ہوگا یا اس سے علٰحدہ رہنا۔

الیکشن میں شرکت کے نقصانات پر ہم اس سے پہلے تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اس موقع پر ان کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

(۲) دوسری قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اگر بالفرض ایسا ہو بھی کہ ہمارے موجودہ خطرات و مصائب کا

علاج یہی ہو کہ ہم موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک کی امداد حاصل کریں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سی پارٹی ایسی ہے جس کو اس حیثیت سے ہم منتخب کرسکتے ہیں — بظاہر بات ہے کہ اس وقت ہم عام ملکی مصالح و مفاد کے پیش نظر پارٹیوں کے فرق و امتیاز پر غور نہیں کر رہے ہیں، اگر ایسا معلوم ہوتا تو ہم خود بڑی آسانی کے ساتھ کسی ایک پارٹی کے حق میں اپنی رائے ظاہر کرسکتے تھے، کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ اس حیثیت سے ان میں باہم فرق و امتیاز پایا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ مختلف اعتبارات کے سامنے رکھنے کی وجہ سے لوگ اس بارے میں مختلف الرائے ہوں، جیسا کہ اس وقت ہے — ہم تو ان پارٹیوں پر اس وقت اس حیثیت سے نگاہ نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس میں سے کون سی پارٹی مسلمانوں کے لیے ان کے اپنے مخصوص اسلامی اور ملی نقطۂ نظر کے تحت قابل ترجیح ہو سکتی ہے، اور اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بعد کم از کم ہمارے لیے ان میں فرق و امتیاز کرنا بہت دشوار رہے۔

الیکشن جب قریب آئے گا اور اس میں مسلمان عملاً حصہ لیں گے تو اس وقت کیا ہوگا، اس کو ابھی جانے دیجیے کہ یہ آئندہ سے متعلق سوال ہے جس کے بارے میں ہم اور آپ جو کچھ کہیں گے وہ بہر صورت از قبیلِ ظن و قیاس ہی ہوگا اور اس میں بحث کی کافی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس کے سلسلہ میں تو ظن و قیاس سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ایک قطعی چیز ہے اس لیے اس پر غور کرنے کے بعد بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ پارٹیاں کیا ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا رویہ و مسلک کیا ہے اور ان کی اب تک کی کارروائیاں مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید یا مضر ثابت ہو چکی ہیں۔

وہ پارٹیاں جن کو مسلمانوں کی طرزِ عمل سے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آئندہ الیکشن میں ان کی اکثریت ان کا ساتھ دے گی اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ

یہ محض ان کے ساتھ لگاؤ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اس وقت ان کی حریف جماعتوں کے طرح طرح کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں، ان کا بھی حال یہ ہے کہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی ان کے اندر مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو رہا ہے درآں حالیکہ ان پارٹیوں میں بعض ایسی ہیں جن کے کندھوں پر اس وقت ملک کے نظم و انصرام کی ذمہ داری بالفعل ہے اور بعض ایسی بھی ہیں جن کا بجائے خود یہ تقاضا ہے کہ وہ ملک میں امن و امان قائم کریں، اور بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر قوم کو عدل و انصاف کے قوانین سے یکساں طور سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آج مسلمان ہندوستان میں طرح طرح کے مظالم کے ہاتھوں اس طرح پریشان ہیں کہ انھیں اپنی بدحواسی کی حالت میں اپنے لیے کوئی راہِ نجات بھی سوجھائی نہیں دیتی بجز اس کے کہ وہ ہنسی خوشی اپنے کو موت کے آغوش میں ڈال دیں، اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ آئندہ آپ کو ان کی ہمدردیاں حاصل ہو سکیں گی اور آپ اس کی وجہ سے ہر فکر سے نچنت ہو جائیں گے؟ اصل یہ ہے کہ مسلمان جن پارٹیوں کو اُمید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں خود ان میں ایسے لوگ گھسے ہوئے ہیں بلکہ ان کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہیں — جن کی طبعی خواہش یہی ہے کہ مسلمان اگر ان کے ہاتھوں نہیں — کیونکہ یہ ان کی یا ان کی پارٹی کی بدنامی کا باعث ہوگا — تو دوسروں کے ہاتھوں ستائے اور رسوا کئے جائیں تاکہ مسلمانوں کو ذلیل و خوار دیکھ کر خود ان کے دل کو تسکین ہو یا مسلمانوں میں احساسِ عجز و بے چارگی پیدا ہو، تاکہ وہ ان کو اپنے اپنے پارٹی کے مقاصد کے تحت جس رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اس کے لیے راستہ ہموار ہو جائے۔

اور ان پارٹیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو مسلمانوں کا اس طرح

نخچۂ مشق بننا دل سے تو پسند نہیں ہے لیکن وہ اس پر اس لیے خاموش ہیں کہ ان مقہورین کی حمایت کے جرم میں وہ یا ان کی جماعت پبلک میں بدنام نہ ہو جائے جس کے ووٹوں ہی پر ان کی آئندہ کامیابی و کامرانی کا دار و مدار ہے۔

اور ایک تیسری وجہ ان کی خاموشی اور تحمل کی یہ بھی ہے کہ ان پارٹیوں کے ذمہ دار لوگوں کو بہر صورت یہ اطمینان ہے کہ مسلمانوں کا ووٹ ان کے سوا کسی کو نہیں مل سکے گا، بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مسلمان دوسری پارٹیوں کی طرف سے جتنا زیادہ ستائے جائیں گے اتنا ہی زیادہ وہ ان کے قریب ہوں گے کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مسلمان اس وقت اس حالت میں پہنچ گئے ہیں کہ ان کو اُن کے سوا اور کوئی دوسرا سہارا نظر نہیں آتا ہے، اس لیے وہ ہر طرف سے پریشان اور زیادہ شدت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔

اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ ایک جمہوری نظامِ آئین نافذ ہے جو اپنی ظاہری ہیئت میں بہت شاندار اور یہاں کی اقلیتوں کے لیے بہت اطمینان بخش نظر آتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عوام اپنے مزاج و ذہنیت کے اعتبار سے ابھی جمہوریت سے کوسوں دور ہیں، اور یہ پارٹیاں ایسے ہی جمہور کا مرکب یا اس کی نمائندہ ہیں، اس لیے وہ ابھی تک عوامی جذبات سے بالاتر نہیں ہو سکی ہیں۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ عوام کے اس مزاج و ذہنیت کی تبدیلی کا اس وقت کوئی سامان بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ جن لوگوں کو اس ذہنیت سے خاص طور سے نقصان پہونچ رہا ہے، وہ بھی اس کی اصلاح میں اپنا واجبی حصہ

ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ اصلاح کی کوشش کرنے کی بجائے اپنے لیے یہ زیادہ مناسب سمجھ رہے ہیں کہ اس حالت کو علیٰ حالہٖ چھوڑ کر اس کے نقصان سے بچنے کی کچھ تدابیر اختیار کریں، خواہ یہ تدابیر ایسی ہی کیوں نہ ہوں کہ ان سے اس ذہنیت کو اور زیادہ استحکام و تقویت حاصل ہو۔ یہ غلطی مسلمان ایک عرصہ سے کرتے چلے آرہے ہیں اور حیرت ہے کہ اس کا نہایت تلخ خمیازہ بھگتنے کے بعد بھی وہ اپنی اس غلطی سے باز آنے کے تیار نہیں ہیں۔ اصل مرض کا علاج سوچنے کی بجائے لایعنی بلکہ مضر تدابیر اختیار کرنے ہی پر مصر ہیں۔

بہرحال یہ الگ بحث ہے، اس وقت کہنا یہ ہے کہ جب ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں کی اصل حیثیت یہ ہے کہ ہم ان میں سے کسی سے بھی اپنی پریشانیوں میں کسی خاص امداد کی توقع نہیں کر سکتے، تو پھر ہمارے لیے یہ سوال کیا اہمیت رکھتا ہے کہ آئندہ الیکشن میں ان میں سے کون سی پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے، جو پارٹی بھی کامیاب ہو، کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ ہمارے یکساں مفید یا یکساں مضر ہو سکتی ہے۔ اگر بظاہر ان میں اس وقت کوئی فرق بھی ہو تو اس فرق کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان میں سے کچھ پارٹیاں فی الحال اقتدار کی مالک ہیں اور ان کے کندھوں پر ملک کے نظم و انصرام کی ذمہ داریاں ہیں، اور دوسری پارٹیاں اقتدار سے محروم اور اس کے لیے کوشاں ہیں، یہ فرق بجائے خود ان میں مختلف حیثیتوں سے فرق کا موجب ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ آئندہ الیکشن میں برسرِ اقتدار پارٹیاں اقتدار سے محروم اور محروم پارٹیاں برسرِ اقتدار آجائیں تو اس تبدیلی کے نتیجہ

میں مسلمانوں کے ضمن میں ان کا موجودہ رجحان ورّویہ بھی بدل جائے، ایسی حالت میں کسی پارٹی کے ساتھ ہر طرح کی امیدیں وابستہ کرلینا اور دوسری سے بالکلیہ مایوس ہوجانا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

ان باتوں کو سامنے رکھ کر آپ خود غور فرمائیں کہ آپ اپنی محبوب پارٹیوں کی حمایت وامداد کی توقع پر اپنے مخالفین کو اور زیادہ برگشتہ کرنے کا جو کھیل کھیلنا چاہتے ہیں وہ کہاں تک آپ کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے ہمارے نزدیک تو یہ سہارا نہایت بوداسہارا ہے اور اس کے اعتماد پر الیکشن میں حصّہ لینا، انتہائی خطرناک بات ہے، اس لیے ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس اعتماد پر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ خطرات و مصائب سے نجات اس ذریعہ سے ممکن نہیں ہے، اس کے لیے کوئی دوسری ہی راہ اختیار کرنی ہوگی جس کا پہلا قدم الیکشن سے علیحدگی ہے جو انشاء اللہ اس خطرہ کے پہلو سے بھی مفید ہوگا۔ اس اقدام سے ایک طرف مخالف پارٹیوں کا جذبۂ عناد کچھ نہ کچھ کم ہوگا یا کم از کم اس میں شدت پیدا نہیں ہوسکے گی اور دوسری طرف اس سے ان کے "دوستوں" کا جذبۂ ہمدردی بھی شاید کوئی عملی شکل اختیار کرسکے کیونکہ اس سے ان کا یہ اعتماد یقینی طور سے متاثر ہوگا کہ مسلمان ہر حال میں ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں اور اس کے بعد یہ توقع ہوسکتی ہے کہ وہ از سرِ نو مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ فائدہ آپ کے نقطۂ نظر سے آپ کے لیے بہت قیمتی ہوسکتا ہے اور ان دونوں فائدوں کے علاوہ اس سے

ایک اور زبردست فائدہ بھی یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں عام پبلک کا غصہ کچھ فرو ہو سکتا ہے جو خواہ مخواہ اس سے برہم ہوتی ہے کہ مسلمان اس کے ساتھ حقوق کے لیے کشمکش کر رہے ہیں۔ اور ان کی یہ برہمی ہمارے لیے دو گونہ مصیبت کا باعث ہے، مخالفین اس کو ہماری مخالفت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور موافقین اس کی موجودگی میں ہمارے ساتھ مناسب برتاؤ کرنے سے ہچکچاتے ہیں، بلکہ اکثر حالتوں میں ان کے جذبات میں عملاً ان کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ ان کو چھوڑ کر کوئی پارٹی نہ اقتدار حاصل کر سکتی ہے اور نہ اقتدار پر تادیر متمکن رہ سکتی ہے۔

(۳) تیسری بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان پارٹیوں میں ہماری ہمدردی یا مخالفت کے اعتبار سے باہم فرقِ مراتب پایا جاتا ہے، اور یہ ہمارے لیے بہت زیادہ قابل لحاظ ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آئندہ الیکشن میں کسی پارٹی کی کامیابی یا ناکامی محض آپ کی تائید یا مخالفت پر منحصر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آپ الیکشن میں حصہ لے کر کچھ دنیاوی فائدے حاصل کر سکتے تھے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تعداد بلاشبہ ہندوستان میں اب بھی بہت زیادہ ہے، لیکن یہ تعداد کہیں اکٹھی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ اگر وہ سب مل کر بھی چاہیں کہ اپنے دو چار امیدواروں کو الیکشن میں کامیاب بنادیں تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے، کیونکہ ہندوستان کا

آئندہ الیکشن مخلوط بنیاد پر ہوگا اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسی نشست ہو جہاں مسلم ووٹروں کی تعداد کوئی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہو، بعض خاص علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں کی نشست کچھ اس طور سے متعین کی گئی ہیں کہ وہ علاقے غیر مسلم آبادی میں ضم ہو کر گویا اپنی اکثریت کھو چکے ہیں تقریباً ہر مقام پر غیر مسلم ووٹروں کی اکثریت ہے اور یہی فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے آپ کی شرکت یا علیحدگی کا الیکشن کے عام نتائج پر کوئی خاص اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپ کی شرکت سے تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ آپ جس پارٹی کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں وہ ناکام ہو جائے اور جس کی ناکامیابی کے متوقع ہیں وہ کامیاب ہو جائے کیونکہ مسلمانوں کی کسی امیدوار کی حمایت موجودہ حالات میں اس بات کی دلیل سمجھی جائے گی کہ وہ "نالایق" ہے اور اکثریت اس کی مخالفت پر تل جائے گی۔ گویا اس طرح الیکشن میں حصہ لے کر مسلمان اپنے کو بھی نقصان پہونچائیں گے اور اس پارٹی کو بھی جس کو وہ کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں ع۔ "ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"

(۴) پھر مصیبت تنہا یہی نہیں ہے کہ مسلمان اس طرح ظاہری طور سے بکھرے ہوئے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان میں کسی طرح کی فکری ہم آہنگی اور یک جہتی موجود نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ظاہری طور سے منتشر ہوتے ہوئے بھی اپنی معتدبہ تعداد کے ذریعہ الیکشن پر بہت کچھ اثر انداز ہو سکتے تھے لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ وہ کسی ایک نقطہ پر نہ مجتمع ہیں اور نہ مجتمع ہو سکتے ہیں۔ اللہ کی مضبوط رسی کو چھوڑ کر وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہندوستان کی کون سی

پارٹی ایسی ہے جس میں مسلمان شریک نہیں ہیں، حد یہ ہے کہ ہندو مہاسبھا کے جنرل سکریٹری کے بیان کے مطابق بہت سے مسلمان مہاسبھا میں بھی شریک ہو رہے ہیں تاکہ آئندہ الیکشن میں اس کو کامیاب بنائیں، گویا مسلمان کی حیثیت ہی اس وقت یہ ہو گئی ہے کہ اس کا خود اپنا کوئی وجود ہے اور نہ اس کا کوئی مخصوص مطمح نظر، وہ ہر اس پارٹی کا ممبر ہو سکتا ہے جس کی ممبری اس کے سامنے پیش کی جائے اور جس کے ذریعہ اس کے خیال کے مطابق کوئی چھوٹے سے چھوٹا دنیاوی فائدہ پہونچ سکے۔ پس جب حالت یہ ہو تو آپ کے پاس آخر وہ کون سا آلہ ہے جس کو استعمال کرنے کے بعد آپ یہ توقع کر سکتے ہوں کہ تمام مسلمان آئندہ الیکشن میں صرف اس پارٹی کا ساتھ دیں گے جس کو آپ نے مسلمانوں کے حق میں بہتر یا کم خطرناک سمجھ کر اپنی تائید کے لیے منتخب کیا ہو؟ اور اگر آپ کا منشا یہ ہو کہ چاہے مسلمان متفق ہوں یا نہ ہوں، جو لوگ کسی پارٹی کو اس نقطۂ نظر سے بہتر سمجھتے ہوں، انھیں اپنی حد تک اس کی تائید کرنی چاہیے۔ تو بلاشبہ آپ کو اس کا حق حاصل ہے اور ہم خود اس اصول کے قائل ہیں کہ ہمیں اپنے عمل کی بنیاد خود اپنے ذاتی فکر و عقیدہ پر رکھنی چاہیے اور اس کے بارے میں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اس میں ہمارا ساتھ دینے والے کتنے ہیں، لیکن اس کے بعد آپ کو یہ دلیل پیش کرنے کا کوئی حق نہیں رہ جاتا کہ آپ کا پسند کیا ہوا یہ طریقہ مسلمانوں کے لیے خطرات کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے مفید بھی ہے، کیونکہ یہاں جس فائدہ پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان سب کے سب یا ان کی اکثریت اس پر متفق ہو، صرف اس صورت

میں آپ کسی بہتر پارٹی کو کامیاب بنانے میں کچھ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر الیکشن میں مسلمانوں کی شرکت سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ان کی قوتیں رائگاں جائیں، ان کا انتشار اور زیادہ بڑھے اور نمایاں ہو، مخالفین کا جوشِ مخالفت اور زیادہ ترقی کرے، اور کوئی ایک پارٹی بھی ان سے زیادہ خوش نہ ہو سکے، اور اگر آپ مسلمانوں کی اس انتشار کی کیفیت کے باوجود اس اعتماد پر الیکشن میں حصّہ لینا چاہتے ہیں کہ یہ پارٹیاں تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى کی مصداق ہیں اور ایسی حالت میں مسلمانوں کی تھوڑی سی جمعیت بھی الیکشن کے نتیجہ کو ان کے حق میں موڑ سکتی ہے، تو یہ بات صحیح ہو سکتی تھی، لیکن ایسا اس وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان بھی ان ہی کی طرح منتشر اور پراگندہ نہ ہوتے، بلکہ جیسا کہ ان کو ہونا چاہیے، ان کی حیثیت "بنیانِ مرصوص" یا "جسدِ واحد" کی ہوتی اور وہ سب مل کر کسی پارٹی کی حمایت یا مخالفت کرتے ہوتے۔ موجودہ حالت میں جب کہ یہ ان سے بھی زیادہ انتشار میں خود مبتلا ہیں اور اس کے ساتھ ہی بدحواسی نے ان کو تدبیر و حکمت سے بھی کوسوں دور پھینک دیا ہے، یہ توقع رکھنا انتہائی سادہ لوحی کی بات ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اس ضمن میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ ان پارٹیوں کی یہ باہمی چپقلش ان کے لیے کتنی ہی مضر کیوں نہ ہو، اس سے آپ کو کوئی فائدہ پہونچنے والا نہیں ہے، اول تو وہ آپس میں کتنا ہی لڑیں بھڑیں، وہ آپ کو اپنے قریب آنے دینے کی روادار نہیں ہیں جب تک کہ آپ فی الواقع اپنے کو مٹا کر ان کے جسم کا جزو نہ بن جائیں اور

اگر آپ قریب جانے کا کوئی موقع نکال بھی لیں تو یہ لڑائی بھڑائی آپ کے لیے اس حیثیت بالکل بے معنی ہے کہ اس میں جو پارٹی بھی کامیاب ہو گی وہ کوئی آپ کی پارٹی نہیں ہو سکتی - وہ انھیں پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی ہو گی اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی آپ کے درد کا مداوا نہیں ہے۔

بزدلی کا طعنہ

اوپر جو باتیں ہم نے پیش کی ہیں ان کے ضمن میں بہت سے لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ کسی ایک یا متعدد جماعتوں کی چیرہ دستیوں کے اندیشہ سے الیکشن سے علیحدہ رہنا خوف اور بزدلی کی راہ ہے جو مسلمانوں کے شایان شان نہیں ہو سکتی اور پھر وہ ایک خاص مجاہدانہ انداز میں تقریر کرتے ہیں کہ کسی قوم کے زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کو خطرات میں ڈالے کہ یہی اصل زندگی ہے یا اس کے ذریعہ زندگی کی راہیں کھلتی ہیں، اور علیحدگی جمود کا پیش خیمہ ہے جس کی حیثیت قوموں کے لیے موت کی ہے۔

اس کے جواب میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ خوف و بزدلی کے سلسلے میں جو کچھ وہ کہتے ہیں ان سے ہمیں سو فی صدی اتفاق ہے لیکن یہ باتیں بنانے والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ الیکشن میں حصہ لینے کی جو دلیل وہ پیش کر رہے ہیں وہ بھی تو خوف و بزدلی ہی پر مبنی ہے، اگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ الیکشن میں حصہ لینا آپ کے دین اور آپ کی ملی حیثیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، آپ الیکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ خود آپ کے قول

یہی تو ہے کہ آپ کو کسی خطرناک تر پارٹی کے برسرِ اقتدار آجانے کا اندیشہ ہے۔ تو پھر آخر الیکشن سے علیٰحدہ رہنے کو آپ خوف و بزدلی کے عذر کی بنا پر کیوں کر رَدّ کر سکتے ہیں۔ اگر اس پہلو سے یہ دونوں راہیں یکساں درجہ رکھتی ہیں تو پھر مدارِ بحث صرف یہی بات ہو سکتی ہے کہ ان دونوں راہوں میں کون سی راہ ایسی ہے جس کو اختیار کرنے سے مسلمانوں کو کم سے کم خطرہ پیش آسکتا ہے، یا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ خطرات سے محفوظ ہو سکتے ہیں اور جہاں تک آپ کی تجویز کردہ راہ کا تعلق ہے یہ بات اوپر کی بحث سے بالکل واضح ہو گئی ہے کہ وہ نہ کسی پہلو سے ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کسی خطرہ ہی کا ازالہ ہو سکتا ہے اس کے برعکس ہم جس راہ کے داعی ہیں اس کا یہ فائدہ نو بین طور سے ہر حال میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ چاہے اس سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن اس سے مختلف مصیبتوں کا سدِّ باب ہو جاتا ہے، اور اگر فی الواقع آپ حرکت وسعی کی زندگی ہی کے طالب ہیں تو آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ہم الیکشن سے علیٰحدگی کا جو مشورہ دے رہے ہیں وہ بس علیٰحدگی پر ختم ہو جائے گا، ہمارے نزدیک تو یہ کام کا ایک منفی پہلو ہے اور حقیقی کام جو ہمارے نزدیک ضروری ہے اس کی حد اس علیٰحدگی کے بعد شروع ہوتی ہے اور یقیناً وہ کام ایسا ہے جس میں آپ کو اپنی حوصلہ مندیاں دکھانے کا کافی موقع مل سکتا ہے، اس لیے اگر آپ کو ترک و جمود کی زندگی پسند نہیں ہے اور اس بنا پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں، تو تھوڑا صبر کر کے پہلے ہمارے پیشِ نظر کام کا ایک سرسری جائزہ لے لیجیے اگر آپ کے ذوقِ کار کی تسکین ہو سکے تو ہمارے نزدیک

اسی کو اختیار کرنا آپ کے لیے مناسب ہوگا کیونکہ وہ کام دینی حیثیت سے بھی آپ کے کرنے کا ہے اور ہمارے نزدیک آپ کی دنیا بھی اسی سے محفوظ ہو سکتی ہے اور یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ کوئی کام جس سے نہ دین کا کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہو اور نہ دنیا کا، محض اس لیے کیا جائے کہ آپ کی بے چینی آپ کو کوئی کام کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ جمود و بے عملی بلاشبہ بہت بری چیز ہے لیکن ایسی سعی و عمل سے تو وہ بہرحال بہتر ہے جو غلط جگہ اور بے جا طور پر صرف ہو اور جس کا نتیجہ کھلے طور پر فائدہ کی بجائے سراسر نقصان ہو۔

ان نقصانات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے بعض لوگ کچھ اور نقصانات کا نام بھی لیا کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ نقصانات کچھ زیادہ لائقِ توجہ یا قابلِ بحث نہیں ہیں، اس لیے ہم ان پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے، البتہ ان کا سرسری تذکرہ یہاں اس لیے کرنا چاہتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ مسلمان اس وقت کس ذہنی ابتری اور انتشار کے شکار ہیں۔

ناخوشی کا اندیشہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الیکشن سے مسلمانوں کی علیحدگی ان پارٹیوں کی ناخوشی کا موجب ہوگی جن کا مسلمان اب تک ساتھ دیتے آئے ہیں، اس لیے چاہیے ان کا ساتھ دینے سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ان کی مروت کے منافی بات ہے کہ وہ الیکشن جیسے نازک موقع پر ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

یہ دلیل پیش کرنے والے تو تھوڑے لوگ ہیں لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ تحت الشعور میں ہمارے بہت سے بزرگ اسی دلیل کو اپنے لیے رہنما بنائے ہوئے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس دلیل پر اپنی انتہائی نفرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے، الیکشن میں حصّہ لینے سے اگر نقصان پہونچ رہا ہو تو یہ مروت نہیں ہے کہ ہم اس نقصان کو کسی کی خوشی یا ناخوشی کے لیے گوارا کر لیں۔ بلکہ یہ انتہائی حماقت کی بات ہے۔ مرّوت کے اظہار کے دوسرے مواقع ہوتے ہیں اور پھر شخصی اور قومی مرّوت میں بھی بڑا فرق ہے، جہاں مرّوت برتنے سے صرف شخصی نقصان پہونچ رہا ہو وہاں یہ چیز جائز ہو سکتی ہے بلکہ بہت سی صورتوں میں صفتِ محمود بھی بن سکتی ہے لیکن اگر اس سے پوری قوم و ملّت کو نقصان پہونچ رہا ہو، تو ایسی مرّوت ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کی جا سکتی، یہ تو خودکشی کے مترادف ہے اور اس کو وہی شخص گوارا کر سکتا ہے جو اپنے شخصی فوائد و مصالح کو قومی و ملّی فوائد و مصالح پر ترجیح دے رہا ہو۔ پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ نہ لینا کسی پارٹی کے لیے ناخوشی کا موجب کیوں ہوگا۔ سوا اس کے کہ اس سے خود اس کو کوئی نقصان پہنچنے والا ہو۔ ہمدردی کا جذبہ تو بہرحال ناخوشی کا محرک نہیں ہو سکتا بالخصوص ایسی حالت میں کہ کوئی قوم اپنا فائدہ علیحدگی ہی میں سمجھ رہی ہو۔ الیکشن میں حصّہ لینے یا نہ لینے کی ہر قوم مجاز ہے، وہ اپنے مصالح کے تحت ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت کو بھی اختیار کر سکتی ہے پھر اس پر کوئی دوسرا جز بز کیوں ہو؟

نہیں کر سکتی، اس کے لیے ٹھوس بنیادیں درکار ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں یہاں کی عام خوش بختی اور بدبختی سے الگ ہو کر اپنے لیے کسی خوش بختی کی توقع نہیں کر سکتے، جو چیز یہاں کی عام آبادی پر مضر اثر ڈال سکتی ہے اس کے اثرات سے ہم اپنے کو بھی محفوظ نہیں کر سکتے، اس لیے جو لوگ اس انداز سے سوچتے ہیں وہ ملک ہی کے دشمن نہیں ہیں بلکہ اپنی قوم کے اور خود اپنے بھی دشمن ہیں، بعض لوگوں کی زبانی اس طرح کی دلیلیں سُن کر ہمیں مسلمانوں کی حالت پر انتہائی قلق ہوتا ہے۔ ان کے نادان لوگ اپنے غم و غصہ کی شدت میں عقل و ہوش کی تمام حدود کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اور یہ حالت انتہائی تباہ کن ہے۔

بہر حال یہ اور اسی طرح کی کچھ اور باتیں الیکشن میں حصہ لینے کی دلیل کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں، لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ نے گذشتہ تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کر لیا ہو گا کہ یہ دلیلیں اپنے اندر کیا وزن رکھتی ہیں اور کہاں تک ہمارے لیے قابلِ قبول ہیں۔

اس بحث سے فارغ ہونے کے بعد اب اس سوال پر غور کرنا ہے کہ الیکشن میں اگر ہم حصہ نہ لیں تو کیا کریں۔ اس کے لیے اس رسالہ کا حصہ دوم جو مسلمانان ہند کا لائحہ عمل کے نام سے علیحدہ شائع ہو رہا ہے ملاحظہ فرمائیے۔